سلسلۂ مطبوعات نمبر ۵

# مردِ مومن

ڈاکٹر میر ولی الدین

کتاب منزل لاہور

طبع اول .................................. سنہ ۱۹۴۴ء

طبع دوم .................................. سنہ ۱۹۴۹ء

قیمت ——— فی جلد ——— دو روپے چار آنے



شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ میں
طبع کرا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# انتساب

میں اپنی اس پیشکش کو مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کے اسمِ گرامی پر جن کے فیضانِ توجہ و برکاتِ تربیت کا یہ راست نتیجہ ہے جذباتِ تشکر و امتنان کے ساتھ معنون کرتا ہوں

عمرِ حریص در طلبِ کیمیا گزشت　　مارا قبول اہلِ نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین

# عرضِ ناشر

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ صاحبِ موصوف مذہب اور دینداری کے زندہ پیکر ہیں، اور اُن کی فیضِ صحبت سے ان کے بیسیوں طالب علم صبغۃ اللہ میں رنگے جا رہے ہیں۔ رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں۔ مزید برآں اپنے مقالات میں جابجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے بکثرت استشہاد فرماتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) بار ایٹ لا اور جامعہ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدرِ شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں، لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوفِ قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں۔

بہرحال یہ کتاب فلسفہ، تصوف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ ان مقالات کے متعلق وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مؤقر رسائل نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے، وہ اہلِ علم حضرات سے پوشیدہ نہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں یہ مجموعہ "قرآن اور سیرت سازی" کے نام سے محدود تعداد میں طبع ہوا تھا لیکن اب پاکستان کی نئی ضروریات و مقتضیات کے پیشِ نظر یہ مجموعہ "مردِ مومن" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

ناشر

# فہرستِ عنوانات

# تمہید

پیشِ نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوع کے اظہار خیالات پر مشتمل ہے، مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انھیں یک جا حاضر کر دیا گیا ہے لیکن نصب العین کی عینیت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں متجلی ہے اور انھیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصراً پیش کرنا مقصود ہے، عہد حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چند ناکامیاب، افسردہ دل، آشفتہ دماغ ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متاعِ دنیوی سے محفوظ ہونے کی نہ قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، یہ مسرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے ہیں، اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں! دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت کا حاصل کرنا دنیوی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے۔ دینی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اُس طرف اُن کا کام پڑتا ہو تو ہو؟

پیشِ نظر اوراق میں اس مغالطہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً بتلایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیئے سیرت کی تعمیر ضروری ہے، اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین و طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں کامیابی محض مال یابی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیتِ روح اور برد قلبی کا جو محض مالیاب کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ دنیوی عقل میں روشنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہویٰ سے آزاد ہو کر علمِ وحی کے تابع ہو جاتی ہے اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہویٰ و ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اند جز مستِ خدا　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہویٰ

(رومیؒ)

کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ حُر کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقویٰ کے اوصاف پیدا کر لیئے ہیں اور حق تعالیٰ کو مہمات دینی و دنیوی میں کافی تصور کیا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔

عقل قرباں کن بپیشِ مصطفیٰ　　حسبی اللہ گو کہ اللہ ام کفیٰ

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن　　دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　ایں عسس را دید و در خانہ نشد

(رومیؒ)

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تسخیر جہات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کانپ اٹھتے تھے! انھوں نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا اسی اسوہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے اور ان اوراق کا مقصد عہد حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مؤلف کو اس اسوہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارف تالم المعرفت[۱] نے بلایا اور اپنی زبان فیض ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جزئی کی کلی وضاحت فرماتے رہے۔ مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور جس کی عقل کو بقول اقبال "تنقید سے فرصت نہ تھی، اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز آگیا تھا اس "صاحب جنون" نے اپنے ایک نکتہ سے کہ عقل تابع وحی ہو کر ہی اپنے بتوں سے نجات پا سکتی ہے، لات و منات کی بندگی سے آزاد ہو سکتی ہے اس کو "دلِ نیاز مند و نگاہِ پاک باز" کا شیدا کر دیا جو حصولِ معرفت کا واحد طریقہ ہے، اس نکتہ کے قلب میں اترنے کے بعد وہی ہوا جس کی اقبال نے خبر دی تھی۔

---

[۱] میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف جو ۲۲۔ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۲ھ اپنے فراق میں محزوں چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے فروح و ریحان و جنت نعیم۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہاں جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصولِ موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر ان ہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لئے خوف و حزن و غضب کے رفعیہ کے لئے، کامیاب زندگی کے لئے طمانیت و بردِ قلبی کے حصول کے لئے۔ ان نسخوں میں سے اکثر کو معارف کے صفحات میں پیش کیا گیا اور اہلِ ملک نے اس کو پسند بھی فرمایا ہے۔ یہاں یہ سب یک جا حاضر ہیں۔ یہ اس دل کا سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں۔

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے　　جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول

(اقبالؒ)

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعقلات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انھی میں مفہوماتِ روحانی کو پیش کیا جا سکتا ہے، لہٰذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

۲۷۔ مارچ ۱۹۴۵ء

میر ولی الدین

# اصولِ موضوعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عبادت و استعانت

اے دردِ دل من اصل، تمنا ہمہ تو
وے در سرِ من مایۂ سودا ہمہ تو
ہر چند بروزگار در می نگرم
امروز ہمہ توئی و فردا ہمہ تو

(ابو سعید مہنہ)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون جلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہے، تحفظِ ذات اور تولیدِ نسل دونوں کے لئے ضروری ہے تاکہ یہ ان چیزوں کی طلب کرے جو اس کی زندگی کے حفظ و بقا میں ممد و معاون ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لے جاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے، اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بری! عضویت پر جب ان کے اثرات کا ترتب ہوتا ہے، تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور توحش، ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے، مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے، تو دوسرے سے گریزاں،

کوشاں ہو کہ گریز اس انسان کی زندگی کا تار و پود یہی جذبات ہیں، ان کا زور مرد افگن ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت نہیں ملتی ہے اور نہ نجات یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔

من بارِغ جہاں رقصے دیدم وبس — مرغش ز ہوا و ہوسے دیدم وبس
از صبح وجود تا شباں گاہِ عدم — چوں چشم کشودم نفسے دیدم وبس

(سحابی استرآبادی)

---

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشیاء کی تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی سکون و ثبات فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرہ کائنات میں ایک تڑپ سی نظر آتی ہے، کاروانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قہری تجلی ہر شئے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے، اور جمالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے ؎

ہستی کہ عیاں نیست دو آں در شانے — در شانِ دگر جلوہ کند ہر آنے
ایں نکتہ بجو ز کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ — گر بایدت از کلام حق برہانے

(جامیؒ)

اشیاء کے اس تغیر و تبدل، تکوین و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشمِ بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے، تو اپنے اپنے فقر و

احتیاج کی وجہ سے ذل وافتقار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی وہ یک دم کٹ جاتی ہے۔ ذواتِ خلق[1] کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے اور اس کو اس ذات کی تلاش و جستجو ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے جو قائم بالذات و مقصود بالذات ہے، جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے، فعّال ہے، سارے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔

---

اب مذہب یا دین کا ماحصل بھی اتنا ہی ہے کہ ذل وافتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے، اور احتیاجات اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذات اللہ رہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ،

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابل عبادت و مستحق استعانت (الٰہ) نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لئے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الٰہ" قرار دیتا ہے

---

[1] یعنی مخلوق۔

خواہ یہ چیز عناصر سے ہو، یا جمادات سے، نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر، ان سے رفعِ احتیاج کے لئے اعانت طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لئے ان سے ذل وافتقار کی نسبت قائم کرتا ہے۔ اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پہ نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کمتر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

حواس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لئے دینِ حق کا یہ پیام محمد عربی (فداہ ابی وامی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا، اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے، تو اسی ایک ہمہ خیر، ہمہ داں وہمہ بیں وہمہ تواں ہستی کے آگے جس کے دستِ قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف ہے اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے! یہی ہستی ہماری الٰہ ہے، یہی قابلِ عبادت ہے، یہی مستحق استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مربوب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات ومرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے، اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں!

یہ پیام صدق محض ہے، ہماری عزتِ نفس کے عین مطابق ہے۔ حق و

خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے! اس کو مان کر انسان حقیقی معنیٰ میں انسان بنتا ہے بے خوف، بے جگر مجاہد جس کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہے جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے۔ اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے، اس کا ضعف قوت سے اس کی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے، موجوداتِ عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین[۱] کا حکم اس کو سارے عالم سے بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے امید و رجا رکھتا ہے الیس اللہ بکاف عبدہ[۲] اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذواتِ خلق سے امید و بیم کی نسبت کٹتے ہی وہ نفس مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے۔ اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن الشئی ہے، کونسی چیز اللہ سے برتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے، اس لئے فرمایا گیا ہے لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم[۳] علو نے تمکین اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے، اس قول کا

---

[۱] اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

[۲] کیا اللہ بندے کے لئے کافی نہیں۔

[۳] تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور نہ شیخی کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا۔

انتم الاعلون واللہ معکم۔[۵۱]

دیکھو "الٰہ" کے فہم نے اس کو کیا سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع اور ضار قرار دیتا تھا، سر عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا، متوش، پریشان، حیران، خود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف ضعف الطالب والمطلوب یا اب علم رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی شمشیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے،

افغیر اللہ تامرونی اعبد ایہا الجاھلون؟[۵۲]

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی   بگذر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیر اللہ کی عبادت و عبودیت کا جوا وہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے عمر میں پہلی مرتبہ حریت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینہ سے اٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک جاتا ہے اور ان کو رحیم پاتا ہے کان بالمومنین رحیما کی بشارت اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ ایمان کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئیں گے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس کے

---

۵۱ تم ہی بلند ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

۵۲ اے جاہلو کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔

دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انھیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے ہر فعل کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وکیل بناتا ہے فاتخذہ وکیلا۔ ان کا فرمان ہے کفی باللہ وکیلا۔ کہہ کر وہ آزادی و اطمینان کے ساتھ مصروف عمل ہو جاتا ہے! اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے ذل و افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے، سچ ہے۔

وما یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء ولا الاموات ؎۱ (الفاطر ۱۵)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا ماحصل، تحفظ توحید، اب اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایت تذلل کا نام ہے، جس کا اظہار معبود حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے، اس کے معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو، عبادت یا اظہار ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دلنشین ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، مصلّی کی طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے انی ذاھب الی ربی سیھدین ؎۲ دل غیر حق سے پاک ہے، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمہ اللہ اکبر

---

؎۱ برابر نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا اور نہ سایہ اور نہ لو اور برابر نہیں جیتے اور نہ مرے۔

؎۲ میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کرے گا۔

کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین، دل پوری طرح متوجہ بحق ہے، ورنہ جانتا ہے کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے یخادعون اللہ وھو خادعھم، اب نیت میں بھی خلوص ہے، حق تعالیٰ ہی کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لئے پڑھ رہا ہے، عادت کے تحت نہیں، انھی کے حول وقوت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت وجبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لاالٰہ غیرک سے ہو رہا ہے۔ اب حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کئے ذلت ومسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہے الحمد للہ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحقِ حمد نہیں، سارے محامد ومحاسن کی وہی ایک ذات لاشریک نہ سزاوار ہے جب رب العالمین کہتا ہے تو جانتا ہے کہ لارب سواہ ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اس کا مربوب ہے الرحمٰن الرحیم کہتے وقت عالم رجا میں داخل ہوتا ہے، رحمت وکرم کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے۔ رحیمیت خصوصی شئے ہے اور مومنین سے مختص کان بالمومنین رحیما مالک یوم الدین۔ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت حق ہے اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا

---

لہ دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا[1]۔ اس امید و بیم کی حالت میں عرض کرتا ہے کہ
اِيَّاكَ نَعْبُدُ حق تعالیٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ ذل و انکسار کا
رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں، وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ آپ ہی سے استعانت کرتے
ہیں، جانتے ہیں کہ لا فاعل فی الوجود الا اللہ ماسوی اللہ سے بالکلیہ اعراض
کرکے آپ ہی کی طرف بالکلیہ رجوع ہوتے ہیں۔ ہم آپ کے سوا استعانت
کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہمیں یہ سنا دیا گیا ہے اور ہم نے بھی
تجربہ سے اس کی توثیق کرلی ہے کہ آپ کے سوا کسی میں حول و قوت نہیں
لاحول ولا قوۃ الا باللہ اس لئے کہ وہ نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر،
اس مدح وثنا و اقرار عبودیت کے بعد التماس و دعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ حق تعالیٰ راہِ مستقیم کی ہدایت فرمائیے، نفس و ہوا سے چھوٹیں
آپ کا قرب نصیب ہو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اہلِ انعام کی راہ پر چلنا نصیب ہو، جو انبیاء و اولیاء
کی راہ ہے، یہی اہلِ انعام ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَ
الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ مغضوبین و ضالین کی راہ نہیں
جنھوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا رشتہ قائم کرکے ہمیشہ کے
خسارہ میں اپنے آپ کو مبتلا کرلیا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ الَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ!

---

[1] جس دن نہ کام آئے کوئی نفس، کسی نفس کا کچھ۔

اس حمد و ثنا، التماس و دعا کے ساتھ وہ کلام ربانی کی چند اور آیتیں احکام خداوندی کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جمانے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے اور حق تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کے لئے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً ابیشی میں جھک جاتا ہے، گویا اپنے رحمان ورحیم آقا کے "پیٹ میں مونڈی" دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس و تنزیہ و تحمید جاری ہوتی ہے، اپنی بے مائیگی، فقر و ذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سمع اللہ لمن حمدہ لہ اسی طرح اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں، جو سر معبودِ حقیقی کے سامنے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے، سچ ہے،

من رکن الی المولیٰ ومال الیہ احرقہ اللہ بنورہ حتیٰ یصیر جوھراً لاقیمۃ لہ (حدیث)

اس سرفرازی کے شکریہ میں وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پھر سجدہ میں گر جاتا ہے، اور اس طرح غایتِ تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی

---

لہ جو اپنے مولیٰ کی طرف جھکتا ہے اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے، تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ لاقیمت جوہر ہو جاتا ہے۔

عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری ہوتا ہے، اس اظہارِ تذلل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ[1]- آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدے سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے، یہی اس کی معراج ہے الصلوٰۃ معراج المومنین۔

معبود کا نہ صرف خیرِ محض ہونا ضروری ہے، بلکہ اس کا ہمہ توان یا قادر مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پوری کرتا ہے، مرادوں کو بر لاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہمیں اس کی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شر کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر نتائجیہ[2] PRAGMATISTS. نے خدا کے ہمہ توان ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو قادر مطلق نہ ہو، وہ معبودِ حقیقی کب بن سکتا ہے، جو خود شر پہ غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے، شر کی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعالِ مطلق، ہمہ توان مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدا سمجھتے ہیں، اسی لئے اس سے استعانت چاہتے ہیں اور اس کے نعم المولیٰ و نعم النصیر

---

[1] میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے (نسائی باب عشرۃ النساء)

[2] زمانہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایم جی ولس، برنارڈ شاہ وغیرہ داخل ہیں۔

ہونے کا یقین رکھتے ہیں اعتصموا باللہ ھو مولٰکم نعم المولیٰ ونعم النصیر[۵۱] جب قوت صرف اسی کو حاصل ہے لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہوتا ہے اور ذاتِ خلق سے اس کی بالکلیہ نفی ہو جاتی ہے، اس حقیقت کے سمجھتے ہی اس کی بصر و بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ[۵۲] کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کا مصداق بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرتِ محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالیٰ سے دعا کرو، دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ ادعونی استجب لکم حق تعالیٰ وجود مطلق ہیں، عطاء محض ہیں، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، مایوسی و محرومی ان کی درگاہ سے نہیں تشفی کے لئے فرما رہے ہیں لا تائیسوا من روح اللہ[۵۳] وہ حکیم بھی ہیں ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اگر

---

[۵۱] تمہیں اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیے، وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے اور اچھا مددگار۔

[۵۲] کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

[۵۳] اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

وہ ہماری کسی دعاء کو قبول نہیں فرما رہے ہیں تو اسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے منعہ عطاء، مرد کا کمال اس میں ہے کہ ان کی منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے،

اگر مراد تو اے دوست نامرادی ماست مراد خویش دگر بار من نخواہم خواست

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے لا ابالی علیٰ ای حال اصبح علیٰ ما اکرہ او علیٰ ما احب لانی لا ادری الخیر لا یہما[1] حق تعالیٰ خود ہمیں تعلیم فرما رہے ہیں، اور ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں،

عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم۔ وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون[2]۔ (البقرہ۔۱۰۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتا ہے، ہمہ آں باد کہ او خواہد آں مراد کہ ما خواہیم، اور خواجہ شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کر دی کہ "عارف اوست کہ منع نزد او دوست تر از عطا باشد" یہیں سے رضا کا مقام

---

[1] مجھے اس امر کی پرواہ نہیں کہ میں کس حال میں صبح کروں گا۔ ایسی حالت میں جس کو میں پسند نہیں کرتا۔ یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لئے بھلائی کس حالت میں ہے۔

[2] شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

شروع ہو جاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔

بہر حال، اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندۂ مومن کی دعا قبول نہیں فرماتے تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں، حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں اور وہ لکل اجل کتاب کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابتِ دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اس کی دعاء کو رد نہیں فرماتے، بلکہ اس کی کسی بلا کو دور کر دیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ مدعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لئے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے،

| | |
|---|---|
| ان العبد یری فی صحائفہ | قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال نامہ پر |
| یوم القیامۃ حسنات لا یعرفہا | وہ نیکیاں دیکھے گا جن کو وہ نہیں پہچانے گا |
| فیقال انہا بدل سوالک فی | اس سے کہا جائے گا کہ یہ اس سوال کا بدل |
| الدنیا لم یقدر قضاءہ | ہیں جو تو نے دنیا میں کیا تھا لیکن تیرے |
| فیہا۔ (حدیث) | مقدر میں دنیا میں ان کا ملنا نہ تھا۔ |

بہر صورت اجابتِ دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں بندے نے دعا مانگی ہے فافہم، اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیوں رسولِ عربی نے اس دعا کی تعلیم

اللھم اکفنی کل مھم من حیث شئت، وکیف شئت وانی شئت ومن این شئت۔

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقق ہو، محض تعقل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت الشعوری نفس میں اتر گئی ہو کہ فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کرنے والے خود بدولت ہیں افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول وقوۃ کا مبدء خود ہیں، اور پھر اس کا بھی تیقن ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں وکان بالمومنین رحیما۔ ولی ہیں واللہ ولی المومنین۔ تو ہم اپنے تمام امور ان کے تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائیں گے طمانیت و مسرت سے ہمارے قلوب بھر جائیں گے اور کسی مست محبت کے الفاظ میں کہہ اٹھیں گے،

وکلت الی المحبوب امری کلہ ۔۔۔ فان شاء احیانی وان شاء اتلفا [۱]

توکل اپنی حول وقوۃ سے بری ہونا ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے التوکل ترک تدبیر النفس والانخلاع من الحول والقوۃ [۲]۔ اور سری سقطی نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے

---

[۱] میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

[۲] توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا، اور اپنی حول وقوت سے نکل آنا ہے۔

التوکل الانخلاع عن الحول والقوۃ۔ ان تعریفوں کا ماخذ، حدیثِ نبویؐ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، اور قول عزوجل لاقوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزیں ہو کہ مجھ میں اور کسی شئے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شئے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں، میرے افعال کے بھی خالق ہیں خلقکم وما تعلمون۔ میرے اقتضار فطرت، عین کے مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں۔ میرا اقتضا، میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے، اس لئے اسباب قطعیہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے۔ حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں، جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا، بھوک کی تشفی کے لئے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں ترکِ عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہنچے ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھن جائے، نظر ان کے فعل پر ہے، فضل پر ہے، اپنے زورِ بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکار دل بیار! توکل ترکِ اسباب نہیں، ترکِ رویتِ اسباب ہے[۱]۔

---

[۱] حضرت شاہ میر قبلہؒ۔

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو، رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا[1] صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا، قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے وفی السماء رزقکم وما توعدون، فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون (پارہ ۲۶ رکوع ۱۷)[2] حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوتا ہے، وہی سینچتا بھی ہے، خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے، الیس اللہ بکاف عبدہ ایجاد ان سے ہے، دوام امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے، تو ان کے لئے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت و ارادے سے پیدا کیا ہے، تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و نوا

---

[1] اور زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں۔

[2] اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم بولتے ہو۔

حاصل ہے، حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا نفقہ ضروری ہے، جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں، ان کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں، نہ کسی سے حاجت و مراد برآری چاہیں، تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں؟[۱] اس کی بشارت اس آیۃ کریمہ میں دے رہے ہیں۔

من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔

جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لئے راستہ نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتے ہیں جہاں کسی کا شان و گمان بھی نہیں ہوتا، جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حق عبادت و عبودیت ادا کرنا ہے پھر ناممکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلائیں، اور پھر ہمیں اپنے احسانات سے محروم رکھیں، وجود بخشی کریں، اور پھر مدد نہ کریں، ہمت کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں، اور ہمارا حق (رزق) ہمیں نہ دیں! وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کرکے ان کی خدمت ادا کرکے کون خسارے میں رہتا ہے۔

من ذا الذی سالک فمنعتہ والجا الیک فاھملتہ او تقرب

---

[۱] مثالیں ابوالعطا سکندری رح کی ہیں۔

ایک فابعدتہ ادھر بیا ایک فطرفتہ [1] رازامبورع حضرت غوث اعظمؒ)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے، "گماں توانیست کہ از رزق چارہ نیست امارزق را زتو چارہ نیست" ؎

بدنبال روزی چہ باید دوید،
تو بنشیں کہ روزی خود آید پدید،

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

ہیں توکل کن طمرزاں پادوست     رزق توبرتوزتوعاشق تر است
(رومیؒ)

بہرحال اتباعِ سنتِ نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن، اجملوا فی الطلب [2] کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے" بعد از طلب می یابی امانہ بہ طلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے،

بجستجوئے نیابد کسے مراد دلی     کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یابی کی مستقل علت قرار نہ دینی چاہئے

---

[1] وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا ملتجی ہوا، اور تو نے اس کو بے کار چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا۔ [2] یعنی دنیا کمانے میں دل توڑ کوشش نہ کرو۔

کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کی جائے عادتِ الٰہی یہی ہے، کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔

دنیا دار الحزن ہے، دار المحن ہے "سجن ہے" (قید خانہ) غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان ہے[1]، جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں۔

الا انما الدنیا دار ماتم ... فانما للحزن مخلوقہ[2]

ھمومھا لا تنقضی ساعۃ ... عن ملک فیھا او سوقہ

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں لقد خلقنا الانسان فی کبد[3]۔ چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں، مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رلاتے اور ہنساتے ہیں وانہ اضحک وابکی۔ مارتے اور جلاتے ہیں۔ وانہ ھو امات واحیی۔ اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں۔ وانہ ھو اغنی واقنی۔ اس لئے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے، کیا حکیمانہ ارشاد ہے:۔

---

[1] قول یحییٰ بن معاذ۔

[2] دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہے کہ وہ حزن و غم کے لئے بنائی گئی ہے، اس کے غم ایک گھڑی کے لئے ختم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لئے ہوں یا بازاری آدمی کے لئے۔

[3] ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔

یاایھا الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا[۱] واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر واستقلال سے کام لو (صابروا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا۔ (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح وبہبودی ہے، یہی نجاح کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر اصبر لحکم ربک اور حق تعالیٰ ہی کے لئے وما صبرک الا باللہ ہاں صرف صبر کرنے ہی سے مصائب کی برداشت سہل ہوجاتی ہے، غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں فکر کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہے، اور راحت کی امید باندھے، تو سوائے حسرت ویاس کے کچھ نہیں ملتا، مولانائے رومؒ نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے:۔

گر گریزی با امید راحتے　　ہم از انجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد وبے دام نیست　　جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک

---

[۱] رباط کے معنی اعدا کے مقابلہ میں گھوڑے باندھنے کے ہیں یعنی مورچہ بندی، اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ما تقدم کے لئے ہوتی ہے (مولانا اشرف علی تھانویؒ)

کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آ لگی، اور تم تڑپ اٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنیوالا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوایا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے،

یا باپ ہے، یا کوئی عزیز،

محبوب ہستی ہے، جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کر سکتے، تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلّی اور صبر کا باعث ہوگا، کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائق لطف کا معائنہ کروگے[1]، اسی طرح ولی مکفا صبر میں حق تعالیٰ اپنے بندۂ خاص سے بطریق منت فرما رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لئے اس کے حکم و بلا پر صبر کرو، کیونکہ ایمان کی حلاوت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیر بلا کا ہدف نہ بنے ع

من ساختہ جاں راہدف تیر بلا یت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بیحد مہربان، رحیم، اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے ان اللہ بکم لرؤف رحیم پر ایمان ہو، کان اللہ غفورا رحیما، پر اذعان ہو اور واللہ ذوالفضل العظیم پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھوگے، مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو پچھنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے! ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی، اس کے جسم کو رگڑتی اور

---

[1] یہ مثال ابوالعطا اسکندری نے دی ہے، بہ تغیر لیسیر یہاں استعمال کی گئی۔

مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دُکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمہارا خیر خواہ طبیب تمہیں ایارج دیتا ہے، اور تم اسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھاگے، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو، اور تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے، تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے، جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے تو ان کا یہ نہ دینا بخل کی وجہ سے نہیں، بلکہ عین رحمت ہے، ان کا نہ دینا ہی دینا ہے، لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے، جو صدیق ہے عسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیرا۔[۱] میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدائد پر بھی اسی طرح شکر فرماتے جس طرح کہ نعمتوں پر، الحمد للہ علی ما یساء و یسر۔[۲]

صرف ایمان کی ضرورت ہے، اور شدت حُب کی۔ ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تجلی ہوتی ہے، مومن کو اس تجلی میں ایسی حلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختی غم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے، اور اکثر اوقات غلبۂ تجلی سے اس کو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا، یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آسکی ہی تو ذرا لینا پر طعنہ

---

[۱] شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔

[۲] شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو بری معلوم ہو، اور جو خوش نظر آئے۔

کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسف علیہ السلام کے ہوش ربا جمال سے وارفتہ ہو کر انھوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے فلما رأینہ اکبرنہ وقطعن ایدیھن[1]۔ زبان حال سے وہ کہہ رہی تھیں:۔

این است کہ خوں خوردہ ودل بردہ بسے را ۔ بسم اللہ اگر تاب نظر است کسے را

شاید یہی معنیٰ ہیں عرفا کے اس قول کے کہ "انسِ قرب سے ادراکِ الم مفقود ہو جاتا ہے۔

ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرار لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اٹھو گے کہ رسول اللہ نے سچ فرمایا حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشھوات[2] بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل وخوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کر لیتا ہے، اور سبھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لئے کوئی اور شئے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلا وغم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراضِ قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں

---

[1] پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں، اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

[2] جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے، جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔

فوزِ عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہوا و ہوس کے شکار تھے، ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے، اور نور سے دور تھے! حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے:- ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین۔[1]

بلا کے اسی فلسفہ سے واقف ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ افضلِ عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابوبکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائیں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا، کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنِّی فَعَّالٌ لِمَا اُرِیْدُ[2]، معروف کرخیؒ فرمایا کرتے تھے، لیس بصادقٍ فی دعواہ من لم یتلذذ بضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا، وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعویٰ عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا واصبر لحکم ربک فانک باعیننا[3] مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے، اور محض اس خیال سے

---

[1] اور جو کوئی آنکھ چرائے رحمٰن کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہی رہے اس کا ساتھی۔

[2] وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔

[3] اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھوٹے رقص کرتے رسول اللہؐ نے اس آیۃ پر وجد فرمایا تھا اور ام المومنین عائشہ صدیقہ آپؐ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لئے سلف کے بعض بزرگ تعزیت مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر لحکم ربک۔ اس کے ساتھ اس قول نبوی صلعم کا سنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا،

| | |
|---|---|
| اذا احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ۔ | جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ اور راضی رہے تو برگزیدہ بنا لیتا ہے۔ |

اب ایک کلی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لئے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے، جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے، مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور، اہل و عیال سے مہجور کسی جگہ تمام دن محنت و مشقت میں گزار رہا ہوں تو واقعی میرے لئے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اس کو مصیبت نہیں سمجھتا کیونکہ مہینہ کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے، یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لئے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآن کریم میں اس شخص سے کی جا رہی ہیں، جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کر رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں! . .

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوے جگہ آیا ہے!

ہم یہاں چندان بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں، اگر وہ ان کو پیشِ نظر رکھے، ان پر یقین و اذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اٹھے کہ "بلا از دوست عطاست و از عطا نالیدن خطاست"!

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں؛ ان اللہ یحب الصابرین۔[1] اور جو حق تعالیٰ کا محبوب ہو اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے، اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے؛ ان اللہ مع الصابرین،[2] اور یہ معیت سوکھی معیت نہیں، جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ لاطاقۃ لمخلوق مع قدرۃ الخالق! صبر ہی سے امامت و پیشوائی نصیب ہوتی ہے وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا؛[3] خلق کی ہدایت کا منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے واسطے اس کا صبر اعدا کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک زبردست سپر ہے وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا۔[4] بالآخر ان پر غالب ہونا اس کے لئے یقینی ہے، فاصبر ان العاقبۃ للمتقین۔[5] اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری ہے

---

[1] اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

[2] اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

[3] اور کئے ہم نے ان میں سے پیشوا جو راہ بتلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے۔

[4] اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے مکر سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

[5] پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔

وتمت کلمۃ ربک الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بما صبروا! یعنی تیرے پروردگار نے جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے عطا کرنے کا وعدہ صبر ہی کی وجہ سے ایفا ہوا۔ صابرین کے لئے غیر محدود اجر کا وعدہ ہے انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب معلوم ہے، مگر صبر کا اجر "بغیر حساب" ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابلِ علم! حق تعالیٰ نے صابروں کے لئے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوٰۃ یکجا جمع کئے ہیں۔

اور یہ اکھٹے ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیئے وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون، اولٰئک علیھم صلوٰت من ربھم ورحمۃ واولٰئک ھم المھتدون۔[1]

اگر درد، گریز پا، سریع الزوال، فانی درد، صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے (اور اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابلِ برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی) تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے؟

---

[1] اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوٰت ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے[۱]، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اوندھا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا درد اس کے لئے ایک نعمت بے بہا نہیں، وہ اس سے متلذذ نہیں ہوگا اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فرطِ اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلے گی،

زہر غم و دست جز شکر نیست ایں تیر نصیب ہر جگر نیست
بد کے دہر آں حبیب جانی شیریں بود آنچہ تلخ می دانی!

اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر:۔

| | |
|---|---|
| یتعاھد اللّٰہ عبدہ | حق تعالیٰ اپنے بندہ کی بلا کے ذریعہ خبر گیری |
| بالبلاء کما یتعاھد | کرتے ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان |
| الوالد الشفیق ولدہ۔ | باپ اپنے بچہ کی خبر گیری کرتا ہے۔ |

صحابہ کرام کے یہی ادراکات تھے اور ان ہی کی قوت سے انھوں نے اپنا سارا تن من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

---

[۱] ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے۔ دل چار طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجرد (برہنہ) اس میں چراغ سا جلتا ہے، یہ مومن کا دل ہے (۲) غلف جس کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہے، یہ کافر کا دل ہے، (۳) منکوس (اوندھا) یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) مصفح وہ دل جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں، یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔

صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، سوائے حق تعالیٰ کے اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ[۱]

دردم نہاں بہ زطبیبانِ مدعی　　باشد کہ از خزانہ غیبم دو کنند

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنیٰ ہیں، یہی نہ کہ ایک رحیم و غیر کریم ہستی سے شکوہ کیا جا رہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی حلاوت اپنے دل میں نہ پائے گا، راسِ صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے من کنوز البر کتمان المصائب وما صبر من بث[۲]۔ (حدیث انسؓ مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے ہائے وائے نکل جائے تو یہ منافیٔ صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو، اور محض استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لئے "انین" (نالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ ولا یقدح فی الصبر یعنی صبر کے منافی نہیں اور پہلی قسم کو بروایت امام احمدؒ قادحِ صبر قرار دیا گیا ہے۔

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنیٰ یہی ہیں کہ توافق با قضا کیا جائے

---

[۱] میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔

[۲] نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے، جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا۔ اس نے صبر نہیں کیا۔

فطری طور پر درد و حزن ہو رہا ہو اور ہوگا، کیسے نہیں یہ تو اقتضائے بشریت ہے، انسان کامل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرمارہے تھے انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون (تیرے فراق نے اے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے اس کے ساتھ توافق کیا جائے، زبان پر ہو ع

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

اور دل میں یہ خیال ہو ع

جہاں دارد اند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسباب قطعیہ کا استعمال جائز ہے، بلکہ ضروری ہے، اور انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارۂ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی، لیکن اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو سبب پر ہو تو اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے، علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے، اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے جو راحت کبریٰ ہے، دنیا میں جنت عالیہ ہے۔

استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے:

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، رنج بھی ہے اور راحت بھی ہے، ظلمت بھی ہے اور نور بھی، قنوطیۃ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبداء ہی کو شر قرار دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (PANDIABOLISM.) کے نظریہ کے حامی

بن گئے، ان کے تجربہ میں یہ دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی، سوائے غم و حزن کے کوئی شئے انھیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیہ نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم والم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہیں، تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں، حقیقی نہیں اعتباری ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے، حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربہ سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو، ہر دو سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے، اور یہیں بارکلے[۱] کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے ESSE LIST PERCOPI.

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور یہ ہر وقت مصروفِ عمل ہیں، ایک لحظہ کے لئے معطل اور بے کار نہیں، خیر و شر، رنج و راحت، لذت والم، نعمت و بلا، انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں، اور حقیقی ہیں۔

---

۱؎ تصوریت کا بانی اٹھارھویں صدی مسیحی کا ایک نہایت ذہین اور تیز فہم فلسفی ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء مادہ کے وجود ہی سے انکار کیا، کائنات غیر مادی روحانی شئے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ بصیرت محمدیہ نے دونوں کے لئے قلبی طریقے بتلائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر قلبِ انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتے ہیں اس کو ایک طرف تو نالہ، فریاد، ماتم سینہ کوبی، یاس و قنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تبختر سے چھڑاتے ہیں، ان سلبی و مضر جذبات سے نجات پاکر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا ہے، اور اس کے لئے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اس کی توانائیاں رائیگاں نہیں جاتیں، صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں، مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہو جائے، ہمت بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہادری سے مقابلہ کیا جائے، حواس بجا ہوں یہی چیز صبر سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو بھول نہ جائے جو تمام حسنات و محامد کا منبع ہیں، اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ دراصل حق تعالیٰ ہی ضار ہیں، اور نافع، نفع و ضرر انھی کے دستِ قدرت میں ہیں، گو جو اس کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے کہ نعمت خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے لیکن چشم بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب و آلاتِ نعمت ہیں اقاسم، مجری و

فاعل و مسبب حق تعالیٰ ہی ہیں وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ ۔ جب انسان اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثنار کی گنجائش نہیں لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ[له] ۔ اجابت، دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے، لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تخلف ہے، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من نزلت الیہ نعمۃ فیشکرھا، جس کسی پر نعمت کا نزول ہو، اس کو چاہیئے کہ شکر ادا کرے،

سیدِ مرسلاں و مرسلِ راز ۔۔۔ داد فرمان بشکر نعمت و ناز
گلِ نعمت برائے ہر کہ شگفت ۔۔۔ شکر آں روز و شب بباید گفت

اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے فصیح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے:۔

اَلنِّعْمَةُ وَحْشِيَّةٌ قَيِّدُوْهَا بِالشُّكْرِ ۔ ۔۔۔ نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھ رکھو۔

خاتمِ ملکِ وحی و خاتمِ دین ۔۔۔ شکر فرمود بر نعیمت و سمین
بانر نعمت چو ہست وحشی را ۔۔۔ صید از قیدِ شکر کن او را
چوں گزاری تو شکر انستیزد ۔۔۔ در شوی ناسپاس بگریزد

---

له اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔

نفسیات کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ انسان کو جب یہ نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر ہوتی ہے، قدر نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازیں احساسِ نعمت کا مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوفت ہو، تعب ہو، تو یہ میرے لئے نعمت نہیں زحمت ہے۔ ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ ازدیاد نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے، نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا یا ہے، شعور کا فقدان نعمت کا فقدان ہے، اسی لئے احساسِ نعمت کو زندہ رکھنا چاہیئے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے، حضرت حسن بصریؒ شکر کو "جالب" "حافظ" کہتے تھے کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی عنایتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے الشاکر یستحق المزید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے! اسی لئے

ہمارے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکرِ الٰہی کی ادائی کے لئے سجدہ میں گر جاتے۔ (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے، اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تحدید کی ہے۔

یا ایتھا الظالم فی فعلہ　　والظالم مردود علی من ظلم[لہ]

الیٰ متیٰ و حتیٰ متیٰ　　تشکو المصیبات وتنسی النعم

ذرا ہمیں اپنی ان نعمتوں کو دوہرانا چاہیئے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمتِ نفع" کو لیجئے، پھر "نعمتِ دفع" کو دونوں بیشمار ہیں "نعمتِ نفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قدو قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسّر ہیں، پھر "نعمتِ دفع" کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپاہج نہیں ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفو[ں] کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے، اس کو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے، اور "نعمتِ عصمت" بھی نعمتِ توفیق یہ کہ اس کو ایمان، توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمتِ عصمت یہ کہ وہ کفر و شرک، نفاق و ارتداد، بدعت و فسق و غفلت سے محفوظ

---

[لہ] اے اپنے فعل میں ظلم کے روا رکھنے والے تجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے، کبتک اور کہاںتک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہے گا اور نعمتوں کو بھلاتا جائے گا؟

رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جائے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت و استعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے تو بے اختیار چیخ اٹھے،

احسان تو شمار نتوانم کرد | بے لطفِ تو من قرار نتوانم کرد
یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد | گر برتنِ من زبان شود ہر موئے

(ابو سعید مہنہ)

سچ ہے ان تعدّوا نعمۃ اللہ لاتحصوھا۔ (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے) اب ان لاتعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ شکر "ادائے شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے"۔ ادائے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر وَھَلُمَّ جَرًّا اِلٰی اِلیٰ نِہَایَۃٍ۔ اس لئے احسان و منت باری تعالیٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے، ان کے حصول کے بعد مرضیاتِ حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے اور یہ حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے!

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں، ہمیں چاہیئے کہ گناہوں کے صدورپر توبہ کریں، حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں، انہ کان للاوابین غفوراً وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنی تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہے، انی غفار لمن تاب

وانی وعمل صالحاثم اهتدیٰ، میں معاف کر دیتا ہوں اس کو جس نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کئے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ وندامت سے گناہ کی سیاہی قلب سے محو ہو جاتی ہے، گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہو جاتی ہے، اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ ۝

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھایا ہے کہ قوت واثر اصالۃً حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہیں لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہماری خوف ورجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں، اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سگ پرستوں کی زندگی کو سکون وطمانیت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا ہے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطر اور حواس باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انھیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ۔

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیئے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم وفعل سے راضی ہو جائیں فاذکرونی اذکرکم، تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، اسی لئے فرمایا کہ اذکروا اللّٰہ ذکراً کثیرا، اور ہمارے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے۔ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ ورضوا عنہ۔

آناں کہ رضائے حق بجاں می جویند  در راہِ رضائے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آں کنند کہ حق فرماید  حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہے دو اجزا پر، عبادت و استعانت پر لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللّٰہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے، اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللّٰہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللّٰہ کی ربوبیت و معبودیت متمکن ہو گئی ہے، جس کے الٰہ قطعاً اللّٰہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللّٰہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللّٰہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے، اور حق تعالیٰ اس کے وکیل ہیں، کفیل ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حفیظ ہیں، اور ہادی ہیں۔

اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے ذات اللّٰہ ہی کو الٰہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا، توحید ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے، ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت وربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت واستعانت کی تصدیق داخل ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق ہے، اس کی تصدیق کے بعد انکار "ارتداد" ہے: یہ مثل شرک کے دین ومذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لئے ناقابلِ معافی! اور بدعت بھی بری بلا ہے، یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے غیر شریعت کو شریعت بتلانا افترا علی اللہ اور ایک گونہ "ادعائے نبوت" ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے پھر توبہ کیوں کرے گا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔

قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت وربوبیت متمکن ہو جائے، اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے احتراز ایمان اور عمل صالح پر استقامت یہ ہے دین یا "بندگی" جس کے متعلق عارف روم نے کیا خوب کہا ہے:۔

گر تو خواہی حری و دل بندگی — بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہرِ بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است
جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندرین حضرت ندارد اعتبار

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی　　کفر باشد پیش او جز بندگی

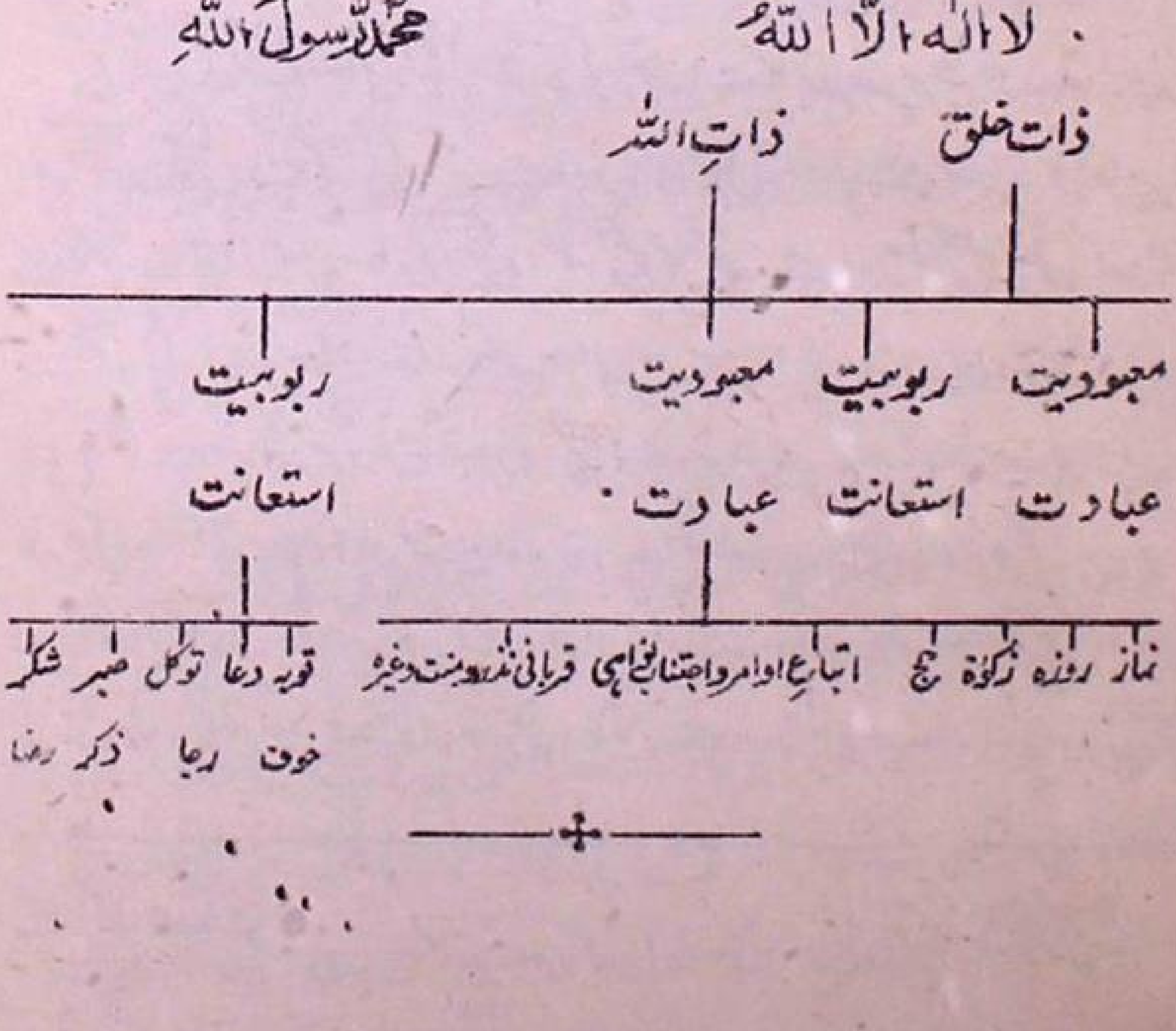
ذوق باید تا دہد طاعات بر
مغز باید تا دہد دانہ شجر

قل هذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی
وسبحان اللہ وما انا من المشرکین۔ (یوسف ع ۱۲)

—— + ——

# ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیش نظر ہو جاتی ہے۔



# نیکی علم ہے

علمے کہ درو عمل نباشد عار است　　ہر سبحہ کہ بے ذکر بود زنار است
ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد　　عالم نبود اعمیٰ مشعل دار است

(میر علی جردیا خانی)

یونان کے شہرۂ آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ پوچھا جائے تو بس یہی مشہور قول ہے کہ "نیکی علم ہے اور بدی جہل" اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب تھا کہ عملِ صالح (نیکی) علم صحیح کا نتیجہ ہے، اور علم صحیح تیقن کے درجہ میں عمل نیک سے جدا و منفک نہیں، ان میں سے ایک ضروری و لزومی ربط پایا جاتا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، سچ پوچھو تو اربابِ علم کی تعریف ہی اس طرح کی جاسکتی ہے "الذین یعلمون بما یعلمون۔" یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں [۱]، ہر کتاب داں و کتاب خواں عالم نہیں قرار دیا جاسکتا، وہ عالم نہیں متلذذ بالمسائل ہے، مسائل علمیہ کا حافظ اور ان سے

---

[۱] رواہ الدارمی۔

لذت اندوز ہونے والا ہے۔ عوام کا یہ ظن محتمل ہے کہ ہر کرم کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، "اعمیٰ مشعل دار" کو بینا جانتے ہیں اور اپنی اس وہم کی تائید میں تعلیل مختل سے کام لیتے ہیں، اس مختصر مقالہ کا مقصود اس بنیادی غلطی کا ارتفاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان کا ابطال ہے ع

یک تنقیۂ دماغ می باید کرد

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ 'نیکی علم ہے' اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو، کیا علم صحیح عمل صالح کے لئے ضروری نہیں ؟ کیا جہاز رانی کے لئے جہاز کی ساخت اور اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح کیا حکمرانی کے لئے مملکت کی ماہیت و مقصد و غایت کا جاننا لازمی نہیں ؟ بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکی کیا ہے، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ خصائل حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت و عدالت کیا ہیں۔ اور ان کی ضد خصائل سیئہ کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں ؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں !

یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہو گا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنیٰ میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرتِ انسانی کا رازدار تھا، اس کی رائے میں فطرت انسانی کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دے گی، کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے

ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھنے لگیں اور اس علم یا عمل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں، لیکن یہ ہماری فطرت کا قصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے علم کا قصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح خد وخال نظر نہیں آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے، اسی لئے "بدی جہل ہے" اور صرف جہل ہی بدی ہے! اور جہل نام ہے علم صحیح کے فقدان کا! جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علم صحیح نہیں، دھوکہ ہے اور اس کا عالم 'عارف' نہیں 'جاہل' ہے!

اگر فطرتِ انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ "کوئی شخص ارادۃً بد نہیں" کوئی شخص ارادۃً شر کو اختیار نہیں کرتا اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی برائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا جب وہ چھوٹی برائی کو چن سکتا ہے، اور ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں پڑتے ہیں لہذا جہل ہی گناہ ہے بدی ہے، جہل سے مراد یہاں عدم علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے، اس لئے جاہل ایک معنیٰ میں عالم کہلایا جا سکتا ہے، لیکن ہر معنیٰ میں وہ احمق ضرور ہے، عوام جنھیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنیٰ میں سفیہ یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں۔

اپنے نفع وضرر سے بے خبر ہوتے ہیں، وہ اشیاء کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ مظاہر کے حسی علم میں گرفتار رہوتے ہیں، وہ اصل میں مستِ خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں، ع

خفتہ دائم خویش را بیدار می بیند بہ خواب (صائب)

جذبات سے زیادہ جہل کی مورت کوئی اور شئے نہیں، ارسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے، ارسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں، عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے اور جذبات ارسطو کے الفاظ میں "روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں" سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ ہر شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لئے اس نے نیکی کو علم قرار دیا لیکن روح انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات، اپنی قوت وشدت کے لحاظ سے مرد افگن ہوتے ہیں، اور انھی کا تسلط انسان کے دل ودماغ پر ہوتا ہے، یہ عقل وحکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کردہ عمل بھی علم اور نیکی سے عاری ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہِ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیرِ اثر گمراہی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چاہ میں گر جاتا ہے، وہ اعمیٰ مشعل دار ہے "چار پائے بر وکتابے چند" کا مصداق ہے، زبانِ سنت میں "علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" ہوتا ہے اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوئی تھی ؎

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس — توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ارسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض علم ہی نہیں ہر عالم مرد صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں، جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں ؎

میانِ بلبل و پروانہ فرق بسیار است — کجا بہ رتبۂ کردار می رسد گفتار

سقراط کا یہ کہنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لئے قطعی ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی راہ نہیں ملتی، لیکن ارسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہیئے، اس کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے، مجاہدہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ع

چند روز جہد کن باقی بخند!

ارسطو کی تنقید لاجواب نظر آتی ہے لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی بات سے اتفاق کروگے، تم کہتے ہو کہ عالم بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نیکی نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہوتا ہے، اور وہ عمل اس کے خلاف کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم یہ یقین کس پایہ کا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جو لوگ دوسروں کو ترکِ دنیا کا سبق دیتے ہیں اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں[1]، ترکِ دنیا کے قائل ہیں

---

[1] ترکِ دنیا بہ مردم آموزند — خویشتن سیم و غلہ اندوزند

اس پر یقین رکھتے، ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے؟ وہ خود بھی شاید یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں اس پر یقین ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل کر رہے ہیں، اگر انھیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اسی کی تلاش کرتے اور حکامِ دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے، اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے میں جانتا ہوں کہ آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لئے میں آگ کے قریب نہیں جاتا، اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے لئے یہ ناممکن ہو کہ میں آخرت کی پرواہ نہ کروں اور "قحبہ مستورۂ دنیا" کی نازبرداری کرتا رہوں جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم و یقین کے فقدان ہی سے شر کا ارتکاب عمل میں آتا ہے، اور بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے کہ عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین" لہٰذا عمل ہی سے حال و یقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا جانا چاہیئے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے محاسبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے اور حال قابلِ اعتبار رہے نہ کہ قال، کردار پر تصفیہ ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر سہ

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　　　که اصلے ندارد دمِ بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم و یقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نیکی علمِ صحیح کا نام ہے، علمِ صحیح قطعاً عملِ صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنی میں "علم" کہا جا سکتا ہے اور لقائے حق ہی سے دیدۂ بینا حاصل ہوتا ہے ؎

دیدۂ بینا از لقائے حق شود　　حق کجا ہمراہِ ہر احمق شود

(رومیؒ)

اب ہم تھوڑی دیر کے لئے "حکمتِ یونانیاں" سے حکمتِ ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نورِ عقل و حس کو نورِ حق سے زینت بخشتے ہیں۔

نورِ حس را نورِ حق تزئیں بود　　معنیٔ نورٌ علیٰ نور ایں بود

(رومیؒ)

نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل "خشیۃ اللہ" ہے (خوفِ خدا ہے) ^له^ اِنَّمَا یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماءُ (پ ۲۲ ع ۱۹) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، اس لئے ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ کفیٰ بخشیۃ اللّٰہ علما وکفیٰ بالاغترار باللّٰہ جہلا۔ جب علم خوفِ خدا کا نام ہے

---

له امام احمدؒ نے مسروقؒ سے نقل کیا ہے۔

کثرتِ روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (لیس العلم بکثرۃ الروایت ولکن العلم الخشیۃ) تو ایسا علم قطعاً عمل کو درست کر دیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، انسان صالح بن جاتا ہے۔ اور اسی معنیٰ میں کہا جا سکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھل، اس بنا پر ہم ہر کتاب خواں وکتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شعبیؒ اپنے وقت کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں "متلذذ بالمسائل" ہو (INTELLECTUAL EPICURE.) سائل سے بحث میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت ہے، عالم سے مراد عالم باللہ فی اللہ عارف باللہ ہی، یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق وخوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کیلئے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا ومحبت کو قرار دیتا ہے۔

اسی علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" کہا گیا ہے اور اس کی درخواست کی گئی ہے، یہ علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے اور اس کو عرفانِ حق عطا کرتا ہے۔ اسی علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے اور اس کو پہچان کر اس سے مانوس ہو جاتا ہے، اس کو اپنے سے قریب بلکہ "اقرب" پاتا ہے، اس کو حاضر و ناظر جانتا ہے اس یافت قرب کی وجہ سے عالم کا انس اللہ سے بڑھتا جاتا ہے۔ اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرض عبودیت

میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے، اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انھیں مخاطب کر کے کہتا ہے:-

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم و زیر پائے تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم و برائے تو زیم

(سحابی استر آبادی)

جب یہ تعلق عبد میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے، اور اس طرح جان پہچان ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لئے کافی ہو جاتے ہیں کفٰی باللہ وکیلا، جو کچھ وہ مانگتا ہے اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے[1]، اور وہ چاہتا وہی ہے جس میں ان کی رضا ہوتی ہے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شئے کا عوض حق تعالیٰ ہیں لیکن ان کا عوض کوئی شئے نہیں۔

لکل شئ اذا فارقتہ عوض     ولیس اللہ ان فارقت من عوض[2]

عارف رومیؒ نے اسی مطلب کو اپنے سریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے درد و غم کا اس کو علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رخ کر کے

---

[1] ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی رہے بدلہ ہے، لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا رہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

[2] لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ۔

وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد اِستش بہ شاہ فرد خویش  یافت در ما نہائے جملہ درِ خویش
چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں  سرد شد بر آدمی ملک جہاں!

جس کو یہ علم نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں قلب خاشع، نفس قانع اور دعائے مسموع۔ جب اصل علم خشیۃ اللہ ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالبِ دنیا نہیں رہتا، وہ طالب علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا۔ اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوریؒ) امام حسنؒ کے الفاظ میں وہ، زاھد فی الدنیا، راغب فی الآخرہ بصیر بدینہ، مواظب علیٰ عبادۃ ربہ، ہوتا ہے، یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راغب ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہوتا ہے، دوسری روایت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے الذی لایحسد من فوقہ ولا یسخر من دونہ ولا یوخذ علیٰ علم علمہ اللہ، یعنی وہ اپنے سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے، اللہ سے اس کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے (اھل العلم

المنافع کلها ازدادو من ھذا العلم ازدادو اللہ تواضعا وخشیۃ و وانکسارا وذلّا (رشحات ابن عمر ؒ) عالم میں خاک کی طرح تحمل، ذل وافتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر و فخر و رعونت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ۔

در خاکِ بیلقان برسیدم بہ عابدے — گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن
گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ — یا ہر چہ خواندۂ درزیرِ خاک کن

علم نافع کا عامل اس فقر الی اللہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے، وہ "غنی بالشئے" نہیں، وہ "غنی عن الشئے" ہوتا ہے، اس کا برگ و ساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز، ذوق و شوق، تسلیم و رضا سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ سراپا صدق و اخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا کچھ حال، اقبال کی زبانی سنو،

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟ — یک نگاہ راہ بین و یک زندہ دل
فقر کارِ خویش را سنجیدن است — بر دو حرف لا الٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر! — بستۂ فتراک او سلطان و میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است — ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است
فقر بر کرو بیاں شبخون زند — بر نوامیس جہاں شبخون زند
برگ و ساز او قرآن عظیم — مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

غرض وہ علم نیکی ہے جس کی اصل خشیۃ اللہ ہے جو اپنے حامل میں قلب خاشع، نفس قانع پیدا کرتا ہے، اور اس کی وجہ سے دعا مسموع حاصل

ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علم نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے پناہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پہ وبال وحجت ہو جاتا ہے، اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا، اس کا دل اپنے رب کے لئے نہ خشوع اختیار کرتا ہے، اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے اور نہ اس کی دعا سنی جاتی ہے، یہ علم نہیں جہل ہے اور تمام بدیوں کا مبدا، ہمیں اس عارف کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کر دے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر اس کو گلشن بنا دے ؎

عارف دل وجاں تو معین سازد    خارے کہ کند بجاش گلشن سازد

کامل ہمہ را زنقص بروں آرد

یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادری ہندوستانی)

# استعمال اصول موضوعہ

# سیرت سازی[1]

شہ نیست کسے کہ تخت عاجے دارد | تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد
یعنی کہ خروس پیش ارباب شعور | سلطاں نشود اگرچہ تاجے دارد

(درد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شئے، سب سے زیادہ گرانقدر اور عزیز شئے پاک سیرت ہے، زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مربی و معلم ہیں، واقعات و حادثات وہ آلات وادوات ہیں، جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی "روح ساز" وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں؟ اس لئے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوز آخرت کا مدار ہے، دین و

---

[1] یہ مقالہ معارف میں مارچ ۱۹۴۲ء اول مرتبہ شائع ہوا۔

دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت بنی ہوتی ہے اور بردِ قلبی اور طمانیت خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے!

بنی آدم کا "اکرام" سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورۃً گو انسان ہے، لیکن حقیقۃً وہ حیوان ہے، یا دیو ہے یا غول ہے، "شیاطین الانس" میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علمائے نفسیات کی باریک بین اور دور رس نگاہ میں ان تیقنات، عادات و میلانات کا مجموعہ ہے جو فرد کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے، اور اس کی وحدتِ کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت اور سیرت میں صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جا سکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہو سکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت ناقابلِ انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا مبدا رنا اور اس کے وہ اقتضاءات و قابلیات ہیں جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہو جاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ عادات کی

تنظیم کا نام ہے، عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن محرکات کا ماخذ و منبع وہ تیقنات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات، ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم و یقین، عمل و عادات یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جا سکتی ہے۔ سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لئے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم و یقین العلم نکتۃ، سیرت سازی کے لئے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دفاتر رنگے جا سکتے ہیں ؎

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است
تعلیم کن گرت بدیں دسترس است

گفتم کہ الف، دگر گفتم ہیچ
در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

(شیخ عزیز الدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی شاہانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الہٰ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں یہ مان رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں۔ عبادت کیا ہے، یہ غایت تذلل کا نام ہے، اظہار ذلت کا نام ہے۔ میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے خالق، میرے مولیٰ، میرے مالک ہی کے سامنے جھک سکتا ہے

اور غیر کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتا! اظہار ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں، محتاج ہوں، میرا معبود غنی ہے، قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان ہے، مدد کرنے والا، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہار ذلت کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی وحمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہوں، جس کے دریوزہ گر سارے شاہ و گدا ہیں، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفیٰ باللہ وکیلا کہہ کر عبادت و استعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں، اور فقر و ذلت یا بندگی کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لئے نہ امیدوں کا مرکز بن سکتی ہے اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سب کا فقر، ان سب کی ذلت و مجبوری، بیچارگی و بے بسی میری نظروں میں اتنی آشکارا و ہویدا ہو جاتی ہے، جتنی کہ خود میری بیکسی و مجبوری، ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالۃً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانۃً چند روز کیلئے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی مالک کو بھول جاتے ہیں، انھی کی محبت میں فریفتہ ہو جاتے ہیں، حقیقی اقتدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے اصلی

فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثمار و عواقب کو جو اس دنیا میں بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہمیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں، زیادہ واضح اور اجاگر طریقہ سے دیکھیں، اور حسرت و ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، جن کے آگے یہ میرا سر جو ساری جہان کے مقابلہ میں معزز و مفتخر بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے، اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ جو اس کی آنکھ چاہے جو تماشا دکھلائے، اور ذہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے، اور نہ فعل و اثر وما بکم من نعمۃ فمن اللہ! صورتوں سے جو ہم نے امیدیں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں اور ان کو رب بنا رکھا ہے، یہ کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے عجز و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہے، عزت نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افترا کے نتائج پر غور کرو، فقیر دل کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملتا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے

جو دوسروں کو دے، امیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت وحرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد دکھ کو دفع نہ کر سکتا ہو، وہ تمہارے درد وغم کا کیا علاج کر سکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ، وہ رب کیسے ہو سکتا ہے، ہائے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس التباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقولِ دشمن پیمانِ دوست بشکستی
ببیں کہ از کہ بریدی وبا کہ پیوستی

معبود ومستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل وافتقار کی نسبت ان ہی سے ہمیں جوڑنا چاہیئے، وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں۔ ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیئے، ان چوب وسنگ یا گوشت وپوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینی چاہیئے، ان سے نفع وضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیئے۔

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی
بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تراشی

حق تعالیٰ کی معبودیت وربوبیت پر یہ یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگِ بنیاد ہے، اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیئے الٰہ باطلہ کی نفی، الٰہ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں، متمکن ہو جائے، تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم الیقین کے مرتبہ سے گزر کر حق الیقین

کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی وہ بفحوائے تخلقوا باخلاق اللہ خلقِ الٰہی سے مزین ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شئے نہیں ہوتی!

توحید معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں، اور مستحقِ عبادت ٹھیرتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے، جس کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعاً و کرہاً اور توحید ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں، وہی خالق ہیں وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے اور انھی سے ہم مدد و اعانت کے لئے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے۔

دیکھو توحید معبودیت و ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے اُمّی مُعلّم (فداہ ابی و امی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفاتِ حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفاتِ رذیلہ جس سے تمام علمائے اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہیں، اس رباعی میں یوں ادا کئے گئے ہیں:۔

خواہی کہ دلت شود صاف چو آئینہ ... دہ چیز بروں کن از درونِ سینہ
حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت ... کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفاتِ قبیحہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لا الٰہ الا اللہ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا جوں ہی اس نے سچے دل سے توحید فی الآثار کا اقرار کیا اور یہ مان لیا کہ لہ ما فی السمٰوات وما فی الارض وما بینہما، اللہ ہی کے لئے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے تو اس نے اپنی مالکیت و حاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم و متصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالکِ حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور بخوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو رنج ہوتا ہے اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اخلاقی بیدا کرنے والے تأثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ع

یک دل داری بس است یک دوست ترا

کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے اور ایک دم رنج وغم، پریشانی و پشیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم — تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ

ولا تفرحوا بما اٰتاکم — نہ آیا، اور شیخی نہ کرو اس پر جو

(پ ۲۷ ع ۱۹) — تم کو اس نے دیا۔

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حریص کیسے ہو سکتا ہے جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں مخاطب کر کے کہتا ہے۔

گماں مبر کہ زر و سیم دادہ اند ترا — ودیعتے است کہ داری بدست روزے چند

چہ سود گر بشوی غرہ بر متاع کسے — چو موش بر سر دکان روستا خرسند

حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت ودیعت و امانت ہیں، اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہیں، اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بنیے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار رہتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنیٰ ہے، بخل ہوتا ہے اپنے مال میں، مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر

قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج ہم و غم، درد و حزن، رنج و الم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہو گئی انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و بردِ قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مربوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت و مملوکیت کا یقین جو موحّد کے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہے، فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔

اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق تعالیٰ کو مان لیا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے قائل ہو گئے نافع و ضار فی الحقیقت انھی کو سمجھنے لگے تو خوف و حزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی، غیر کو نافع و ضار قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہے، اور اس امید کی شکست حزن و غم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے۔ اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو

خوف سے بھر دیتا ہے، جونہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا اور حق تعالیٰ کی اس تنبیہ کو یاد کیا کہ،

| | |
|---|---|
| ولا تدع من دون اللہ | اللہ کے سوا کسی کو مت پکار ایسے |
| ما لا ینفعک ولا یضرک | کو نہ بھلا کرے تیرا اور نہ برا، |
| فان فعلت فانک اذاً من | پھر اگر تو ایسا کرے تو تو ہو جائے |
| الظالمین۔ (پ ۱۱ ع ۱۲) | ظالموں میں۔ |

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی امید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ سے جاتا رہا اور حزن وخوف سے تم نے ہمیشہ کے لئے نجات پالی۔

| | |
|---|---|
| ان الذین قالوا ربنا اللہ | مقرر جنہوں نے کہا کہ رب ہمارا |
| ثم استقاموا فلا خوف | اللہ ہے! پھر ثابت قدم رہے |
| علیہم ولا ہم یحزنون۔ | تو نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین |
| (پ ۲۶ ع ۲) | ہوں گے۔ |

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سارا نقطۂ نظر بدل گیا، نقطۂ نظر کا بدلنا تھا کہ زمین و آسمان بدل گئے ؎

چوں برخیزد خیال از چشم احول
زمین و آسمان گردد مبدل

ایک وہم تھا، خیال تھا جس نے تمہیں خوف وحزن کی زنجیروں میں

جکڑ رکھا تھا، اب تم نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا، اور تمہاری روح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کر کے چیخ اٹھی،

| | |
| --- | --- |
| اللھم اسلمت نفسی الیک ووجھت وجھی الیک وفوضت امری الیک والجات ظھری الیک رغبۃ ورھبۃ الیک لا ملجاء ولا منجاء منک الیک[1]۔ | اے اللہ میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی اپنا منہ تیری طرف کیا، اپنے کام تیرے حوالے کئے، اپنی پیٹھ تیرے سامنے جھکائی، تیرے فضل کی امید میں اور تیری ناراضی سے ڈر کے، میری پناہ اور نجات کا مرکز تو ہی ہے۔ |

اس اقرار ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعتماد و یقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں نفع و ضرر سے خالی تمہارے ساتھ تعاون عمل کے لئے تیار، تمہارا رفیق و خادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستہ میں تمہارے قدم بے باک انداز میں اٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہو گیا، کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہو گیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہو سکتا ہے، حواس کی آنکھ جس کو دشمنِ بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے، اور

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے، رواہ الجماعۃ عن البراء بن عازب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت آخری چیز یہ پڑھتے تھے

سعدیؒ کے پر اثر الفاظ میں کہہ رہی ہے،

چوں دشمن بلیے رحم فرستادہ او ست

بدعہد اگر نہ دارم ایں دشمن زدوست

اسی وقت غیظ و غضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہوگیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت، ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، معلم حقیقی کی طرف سے ایک تنبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس و شیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین و اذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے؟

ریا جو خلق کے لیئے اپنے اعمال کی تزئین ہے، اسی وقت ممکن ہے جب خلق کو نافع و ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور ہوجانے کے ساتھ ہی ریاکاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق تعالیٰ ہی کے لیئے جاری ہوجاتا ہے، حور و قصور کے لیئے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بافی کا محرک، یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے، یا ضرر کے دفع کا خیال، یا پھر خود بینی و خودستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیت حق ان صفات ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لیئے

موحد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے والموفون بعھدھم اذا عاھدوا[1] کا مصداق۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے، غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین، ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع وضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد میں مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحتِ علمی نے دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب یعنی سیرت سازی کے لئے سب سے پہلے شرک فی المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت حاکمیت اور ربوبیت ذواتِ خلق سے کاٹ دی جاتی ہے اور الا سے اس کا اثبات ذاتِ حق میں کیا جاتا ہے اور اس طرح اخلاقِ الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا کی جاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لئے ضروری ہیں، اس کی توضیح میں چند مقامات کا پیشِ نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتدا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے، لیکن

---

[1] پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں۔

علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے، لیکن قلب میں جاگزیں نہیں ہوتا، اس لئے عمل کی صورت میں نمایاں ہونیکی قوت نہیں رکھتا اور اس لئے منفعت بخش نہیں ہوتا[۵۱]، علم سے ہماری مراد یقین واذعان ہے، جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تدبر یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے[۵۲]، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے[۵۳] مضبوط ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے، اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے، جب عمل کی تکرار رہتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرت ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لئے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقت رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے، سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لئے کہا گیا ہے ع

چند روز جہد کن باقی بخند

---

۵۱ ایسے علم سے استعاذہ کیا گیا ہے، اعوذ بک من عمل لا ینفع ومن قلب لا یخشع۔

۵۲ تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سبعین سنۃ (الدیلمی ورواہ ابو الشیخ من حدیث ابو ہریرہ)

۵۳ قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنی وفرادی ثم تتفکروا (پ ۲۲ ع ۱۲) سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے،

(۲) مجاہدہ، پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں اسی طرح بغیر عمل صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں، اسی لئے فرمایا گیا:- جاھدوا فی اللہ حق جہادہٖ[۱] اور صحیح عقیدہ و مجاہدہ ہی کی چشم بصیرت افروز کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دی جاتی ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا[۲] اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔

ذرا اپنے ذہن کے نہاں خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات، تصورات خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے، علم کا ایک دریا ہے، اُڈا چلا آرہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی مبداء سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی، اس کی آمد کسی طریقہ سے روکی نہیں جا سکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر

---

[۱] مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیئے، اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پ ۱۷ ع ۱۰)

[۲] جنھوں نے ہمارے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہیں سمجھا دیں گے (پ ۲۱ ع ۳)

قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کر دے، یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری واضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے۔ اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے میدان میں تخت بچھا دوں اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت ووقار سے بٹھا دوں، یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازے سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لئے آؤں اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر ہے کہ نور وظلمت کے مقابلے میں نور ہی کامیاب ہوگا کیونکہ ظلمت نور کے غیاب کا تو نام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہدہ حق تعالی ہی کی حول وقوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرتے ہی مجاہدہ کی روح "خیر کے مبداء" کی طرف استعانت کے لئے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی، اپنی بیچارگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے اور چیخ اٹھتی ہے۔

سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزت والعظمة والجبروت

سبحان الحق الذی لایموت اعوذ بعفوک من عقابک واعوذ برضاک من سخطک واعوذ بک منک جل وجھک۔[1]

اور یہ لامتناہی عزت وجبروت، یہ لامحدود ملک وملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں، وہ جو بالذات ہے جہاں ہیں موجود ہر جگہ "ہمارے پاس ہی تو ہے رگِ جان سے زیادہ قریب ہے، بما از ما نزدیک تر"! وہ الغیاث کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شر کا صدور بھی نہیں ہونے پاتا،

نفسیات کے اس مسلمہ قانون کو یاد کرو، جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی تنظیم وترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے، جونہی ان خیالات نے کتم عدم سے سر نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکر لی، اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ نامتناہی قوت وجبروت کے مبدء سے اخذ فیض کیا اور اس طرح بے پناہ طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگا دی اور ان کا قلع قمع کر دیا، جب

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جس کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتداہی میں روک دیا گیا تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرت بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے، جب وہ تخیل کے دروازے سے خانۂ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول وقوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مرد افگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے ورود کے وقت ہی انھیں پچھاڑ دیا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کی حول وقوت سے ان کا سامنا کیا جائے، اللھم اعذنی من شر نفسی[1] کی فریاد فوراً بلند ہو، اعوذبک منک، کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست نا ممکن ہے، کامیابی قطعی ہے حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنیٰ رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے ان کی معیت کے ساتھ ہی بلندی نصیب ہوتی ہے، انتم الاعلون واللہ معکم[2] کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

---

[1] اے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے۔

[2] تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہیں۔ (پ ۲۶ ع ۸)

یہی نفسیاتی الٰہیاتی طریقہ بدعادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، بدعادات سے مراد کوئی عادت ہے، جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں، بدعادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بدعادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بردقلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے، لہذا بدعادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر منحصر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہو جاتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو لیکن خیال ہمارے تصرف میں آ سکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو، اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر پینا چاہیے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے، ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے، اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ "خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

بہرطور بری عادتوں کے آہنی نتیجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت

دیکھنی پڑے، تو ہیں مایوس، و رنا امید نہیں ہونا چاہیئے، مجاہد کے نزدیک یاس کفر ہے، گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادتِ بد کا پھر ایک مرتبہ باوجود عزم راسخ کے کہ ایسا نہ ہوگا، شکار بننے کے بعد جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں، اور وہ وقت بہت جلد آپہنچتا ہے، جب وہ شخص اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خودساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیئے آزاد ہو جاتا ہے، عارف رومیؒ نے مجاہدہ کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش — تادمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمے آخر دمے آخر بود — کہ عنایت با تو صاحب سر بود
دوست دارد دوست ایں آشفتگی — کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی!
کارکن کن تو و کاہل مباش — اندک اندک خاک چہ را می تراش
چوں زچاہے می کنی ہر روز خاک — عاقبت اندر رسی در آبِ پاک
چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے! — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

بہرحال مجاہد ہمت سے کام لیتا ہے، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے اس کو استعمال کرتا ہے اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ روح کا تجلیہ نہ ہو جائے وہ دم نہ لے گا، اور خوش مجاہدہ ادا کرے گا، ولولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ گنگناتا جاتا ہے:

دست از طلب ندارم تا کارِ من بر آید — یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

کامیابی و فتحمندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے کان حقا علینا نصر المومنین کا وعدہ اس سے متعلق ہوتا ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لنھدینھم سبلنا کا قول پورا ہوتا ہے،

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا، حقوقِ نفس کو تلف کر لینے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوق نفس" کا ادا اور غیر شرعی "حظوظ نفس" کا ترک کرنا ہے، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالات فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو سلبی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے وہ اعمالِ سیئہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لئے امتثالِ امور، اجتنابِ محظور اور رضا بہ مقدور آسان ہو جاتے ہیں، جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں[1]!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو سرچشمہ ہیں تمام محامد و محاسن کا! تمام خوبیوں اور نیکیوں کا جو مبدا ہیں طمانیت و سرور کا، علو و بلندی کا، قوت و عزم کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جمالنے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں پاؤ گے کہ یہ تمام صفات مقید پیمانے میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں، نفسیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال اور

---

[1] فتوح الغیب مقالہ اول۔

دھن میں رہتا ہے، رفتہ رفتہ اسی کی خوبو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے یا نفسیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معروضِ فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر کہ تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے، ایجابی خیالات ہی کو جمانے اور بسانے کی کوشش کرو گے، اب ہم عارفِ رومؒ کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظہ کے لئے حقیقی معنیٰ میں خوش رہ سکتے ہو

کیست از وے بہتر بگو اے ہیچ کس
تا بداں دلشاد باشی یک نفس؟

اگر تمہیں چشم بصیرت ملی ہے، اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ کی دھن سے بہتر اور کسی کی دھن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اسی دُھن میں گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ رفتہ رفتہ جامیؔ سامی نے جو کہا تھا، اس کا تم کو تحقق ہونے لگے گا ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی | در بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است اگر روزے چند | اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائے گی اس کا ذکر کیا کریں، لیکن تحریص کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ تم پر سرور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے اطمینانِ قلب، جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا، وہ نقد دم ہوگا، اور اس آیۃ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے۔

یا ایتہا النفس المطمئنۃ | اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا

| | |
|---|---|
| ارجعی الیٰ ربک راضیۃ | پھر چل اپنے رب کی طرف تو اس سے |
| مرضیۃ فادخلی فی عبادی | راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو |
| وادخلی جنتی۔ | میرے بندوں میں اور داخل ہو |
| (پ ۳۰ ع ۱۴) | میری بہشت میں۔ |

نفسِ مطمئنہ کا حصول، رضائے الٰہی کا تحقق، جنّت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس مجاہدہ کی تکمیل کے! جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت وشہود سے حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہاں" ہیچ ہیں، جامیؒ اس ذوق ومستی کو اس والہانہ انداز سے ادا فرماتے ہیں:۔

کانِ بلبلِ جان مست بیاد تو مرا | وے پایۂ غم پست بیاد تو مرا
لذتِ جہاں راہمہ در پا فگند | ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا

حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری ہے فاذکروا اللہ ذکرا کثیرا، پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود رضا وقربِ الٰہی ہو، جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکز ہو گی، تو خود بخود فاسد سفلی پریشان کن خیالات اور وساوس کا دروازہ بند ہو جائے گا اور جونہی خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی، ایک روحانی کیف وطمانیت سے تمہارا قلب مملو ہو جائے گا۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے، اور ذہول وغفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے، اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے

حصول سے تمہیں لذت ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج! لکیلا تاسوا علیٰ مافاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی، تم عارف روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو

روزہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گر ہم تمہیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم جانتے ہو کہ ہر شئے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شئے ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیا سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں ان ہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں، چونکہ یہ فانی اور گریزپا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانون ایتلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شئے کو دیکھ کر تمہارا خیال شئے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئے گا، اور اینما تولوا فثم وجه الله کے معنیٰ کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا شئے کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جائے گی اور اس طرح یاد قائم ہونے لگے گی، تمہارا معروض فکر اب شئے نہیں حق ہوگا، اور ان تمام انوار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگے گا جو وجہ اللہ کی طرف رخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں:

اس طریقہ سے تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کا جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے، آفاق میں

حق تعالیٰ ظاہر ہیں، ہر شئے کے ساتھ جہت حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطۂ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ انفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہاں و عیاں ہیں، انھی سے تعلق قائم کرنا انھی کی یاد کا جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استغراق اور فنائیت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے، من یعرض عن ذکر ربہ یسلکہ عذابا صعدا۔ جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (پ ۲۹ ع ۱۱)

اسی مفہوم کو رومیؒ کے دل نشین الفاظ میں یاد رکھو:۔

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازانجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دل کش نظر کیوں نہ آئے، نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح خد و خال میں کہاں نظر آتی ہیں، کسی شئے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دے گا! پھر تمہاری نظر میں اشیاء کی یہ دل فریبی تمہارے نفس کا دھوکا ہے، التباس ہے، تمہارا واہمہ بھی تو خلاق ہے۔ کیسی کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لئے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل ہوتی ہے، تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی یہ اعتماد ہوتا ہی، ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری

طبیعت میں استقلال نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اٹھو، اگر تمہاری چشم بصیرت کھل جائے اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیا، ویسی ہی دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ ڈ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہو گی، طمانیت و برد قلبی حاصل ہو گی، خوف و حزن زائل ہو جائے گا، استقلال و استحکام عطا ہو گا اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفا ہو گا۔

| | |
|---|---|
| من عمل صالحًا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیٰوۃً طیبۃً۔ (پ ۱۴ ع ۱۹) | جس نے نیک کام کیا، مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہے تو ہم اس کو زندگی دیں گے ایک اچھی زندگی۔ |

یا دحق کو قائم کرنے، تمہارا رخ ظلمت سے نور کی طرف پھیرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان کرنے، خلق سے توڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت کا اثر نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے[۱]۔ ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے کی استعداد یا صلاحیت

---

[۱] ومثل جلیس الصالح کمثل صاحب المسک ان لم یصبک منہ شیٔ اصابک من ریحہٖ ومثل جلیس السوء کمثل صاحب الکیر ان لم یصبک من سوادہٖ اصابک من دخانہ (ابو داؤد و نسائی عن انس) نیک ہمنشین کی مثال مشک والے کی سی ہے۔ اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہنچے گی اور برے ہمنشین کی مثال لوہار کی بھٹی کی سی ہے اگر تجھ کو اس کی سیاہی نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچے گا۔

پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایعازی" OUTOSUGGESTION. کہا جاتا ہے، اور جب کسی خارجی ذریعے سے حاصل ہوں تو "غیر ایعازی (HETERO-SUGGESTIONO) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایعازی اور غیر ایعازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزو ذہن بنا رہے ہیں، اگر سلبی یا اضلالی افکار غیر ایعازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بُری صحبت میں ہیں اور ان کے تیقنات وافعال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطراری طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں ان کے سمّی اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحبت ناجنس سے قطعی احتراز کریں ؎

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰ گریخت
صحبت احمق بسے خونہا بریخت

سلبی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لئے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر وقوت رکھتا ہے۔ وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے یقین واذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علم حق کو شیخ اکبر محی الدین عربیؒ نے علم "اذواق" قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الاذواق لا عن الاوراق وھو العلم الصحیح وما عداہ فحدس وتخمین لیس العلم اصلا۔ یعنی علم حق ذوق ووجدان سے حاصل شدہ علم ہے محض کتابوں سے

حاصل کردہ نہیں، اور یہی علم صحیح ہے، باقی اٹکل پچو، مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدءِ نبوت سے اخذ کردہ ہے، قطعی و یقینی ہے، حقیقی واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہِ راست اسی مبدء سے علم حاصل کرنے لگے ہیں، اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ[1] اس پر دلیل ہے، اسی لئے ایک دوسرے راز داں کی نصیحت ہے، کہ خذی العلم بافواہ رجال اللہ ولامن الصحائف والدفاتر۔ مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں میں قیاس وتخمین وظن ورائے کے سوا کیا رکھا ہے، اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، ان کے افعال واعمال، ان کے افکار وخیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے جاتے ہیں، اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے مجتنب اور محترز اور بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے، عارفِ روم نے صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے،

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی — یا در رہِ دیں صاحبِ دردے گردی
ایں را بجز از صحبتِ مرداں مطلب — مردے گردی چو گرد مردے گردی

یہ کونوا مع الصادقین کے حکم کے پنہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً

---

[1] اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

ایک دفعہ پھر دہرا لیجئے، اذا تکرر تقرر، تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا سنگِ زاویہ لا الٰہ الا اللہ پر پختہ یقین و اذعان ہے تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا کہ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ، اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، اللہ ہی لائق عبادت ہیں، استعانت انہی سے کی جانی چاہیئے، میرا سر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں، اس بنیادی عقیدہ کا زبان سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو پختہ کرتی ہے، جس قدر یقین میں پختگی ہوگی، اسی قدر عمل میں سہولت ہوگی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لئے غور و فکر، تدبر و مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائے گا، اسی طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیئے، ذلت (جو عبادت کی اصل ہے) حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں، حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، معز و مذل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا اسی لئے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متمکن،

| | |
|---|---|
| اللّٰھم کما منعت وجوھنا | الٰہی جس طرح تو نے ہمارے |
| ان تسجد لغیرک فصن | چہروں کو غیر کے آگے سجدہ |

ایدنا ان تمتد بالسوال    کرنے سے بچایا، اسی طرح ہمارے
لغیرک۔    ہاتھوں کو اپنے غیر کے آگے سوال
کرنے سے بچا لیا۔

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت غلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے، وہ نفع وضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت اس وہمی نفع ونقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، اجارہ اساسی کو پختہ کرتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ خاطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی وہدایتی علم سے بدلا جائے، قانون "تقطیب افکار" LAW OF THE POLARISATION OF THOGHT نفسیات کا ایک مسلمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں مبدل کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اللھم اجعل فی نفسی نورا، اللھم اجعلنی نورا ۔ کی دعا قبول ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ سرور وطمانیت ہے مسرت وسعادت ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص مسرور ومطمئن ہوتا ہے، اس کی جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے وہ قطرہ کہ نور ہوتا ہے، غم سے فارغ او دائماً مسرور ہوتا ہے، بس

روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن میں باقی رہ سکتی ہے، الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون، الذین اٰمنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ لاتبدیل لکلمات اللہ ذٰلک ھو الفوز العظیم۔ (پ ۱۱-ع ۱۱)

# تصحیحِ فکر[1]

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ — مابقی استخوان و ریشۂ
گر گل است اندیشۂ تو گلشنی — ور بود خارے تو ہمہ گلخنی

(رومیؒ)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار، افعال و اعمال میں ظہورپذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے، اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت، لہٰذا جیسے خیالات ویسی کائنات، انا عند ظن عبدی بی۔

یہ قانون ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانون تجاذب دائرۂ فطرت میں، قطعی و یقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل د

---

[1] یہ مقالہ "بزم فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر سنایا گیا، جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ فلسفہ کی بزم مباحثہ ہے اور معارف اپریل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

تعیین میں افکار و خیالات ہی کی کارفرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار و خیالات کی اصلاح اس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے، قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاح خیال پر منحصر ہے۔ ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد

مقاصد و غایات کا دائرہ ذہن انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت و غایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین غور و فکر سوچ اور بچار پر منحصر ہے، فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے اور یہی ان دنوں انسان میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے، اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے، اس کے لئے آپ کو چند قوانین عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خس و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہئے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین میں انھیں بونا چاہیے، ہمیں اس امر کا بھی خیال رہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے تاکہ شدت تمازت انھیں جلا نہ ڈالے، اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقت بقدرہ گزر جائے اور بالآخر گلِ تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشو و نما کا

موقع نہیں ملے گا، بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے خس و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامنِ زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ باد و باراں، آفتاب و حرارت، بیجوں کے نشو و نما کے لئے ضروری ہے، طوفان تک انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہیں۔

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بحمد اللہ گزر گئی، باریک بیجوں نے خوش رنگ و دلفریب لالہ و یاسمین کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں اور یہ علم مرتبۂ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے، وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں جس کا یہ بیج ہے کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے دل کا سرور آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "بہجتِ قلبی، نورِ بصری، جلاءِ حزنی، ذہابِ ہمّی" کہہ سکتے ہیں!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی نئی بات نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ

بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں، جو زندگی کے بیج میں مستور ہے، وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے، ان چیزوں کے حصول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بیجوں کی ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالم اکبر) میں باغ لگایا تھا شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالم اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل وقوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدانِ فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے، جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پا سکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، جانتے ہو کہ خس و خاشاک ہے کیا؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پہ شر انگیز، بد، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیئے، اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو جس کا ہم نے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں اعمال کی تکرار عادات راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوائے ان عادات راسخہ کے منظم مجموعہ کے اور کوئی چیز نہیں اور ہماری سیرت ہی

ہماری قسمت کا دوسرا نام ہے! سلبی خیالات فاسد مقاصد کا تعین کرتے ہیں۔ انھی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بن کر سیرت بد کی تشکیل کرتا ہے اب میکانکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس۔

میدانِ فکر کا سلبی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سلبی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مردافگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے اب حیات (یا چشمہ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر سہی تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلے سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیئے، ظلمت کا مقابلہ نور سے، ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیئے، ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا

ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے[1]۔ اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و ہمت پر نظر جماؤ، خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کے بجائے حلم، بیماری کے بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، خلوق کی جبہ سائی کے بجائے رازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جمانا چاہیئے۔ تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا، رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جامی سامی کے اس قولِ بلیغ کے ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی — ور بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است اگر روزے چند — اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

اس فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دنیا میں وہی چیز بری ہے جس کو ہم برا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو برا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمہارے اختیار میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کر دو، پھر اس ملاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیوں سے بچا نکالا ہو، تمہیں ہر طرف سکون نظر آئے گا، اگر تم اپنی رائے کو

---

[1] احادیث میں خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے، اوپر علاج پیش کر رہے ہیں، اس کا استنباط انہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے۔

ترک کر دو تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا۔ اس شکایت کو ترک کر دو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں" خیالات کا ماحول پر اثر ناقابلِ انکار ہے، خیالات کی پختگی اور قوت انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ مرکوز کرتا ہے، ان ہی کو ذہن میں دہراتا ہے، اٹھتا ہے، پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے، اور یہی خیالات عالم آثار میں عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے، عمل اس کا ظہور ہے، ولیم جیمس نے سچ کہا ہے: "زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری مشکل ذہنی مشکل ہے"

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو، باغ کے پھولوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے، اور جس طرح بیج کو پودے کی شکل میں نمایاں ہوتے کچھ عرصہ لگا تھا، اور تمہیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے خس و خاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے تو شادمانی و مسرت، طمانیت و بردنلبی، سرور و کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے

طور پر تمہیں حاصل ہوں گے۔

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں، اگر اس کا کوئی دشمن ہو تو خود اس کا نفس ہے، اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک (البیہقی میں حدیث ابن عباسؓ) اس لئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے، اور نہ کسی کی مذمت، بردقلبی کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید قرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال نتیجہ ہے ماضی کا، قسمت نتیجہ ہے خیالات کا!

| | |
|---|---|
| کامل گوید جہاں تمام واہل است | ناقص گوید کہ کوتہ است و سہل است |
| شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں | ایں بردن و باختن زعلم و جہل است |

(سحابی استرآبادی)

# قانون تجاذب اور سیرت سازی

بدا گنم و نیک طمع می داری — ہم بد باشد سزائے بدکرداری
با آنکہ خداوند کریم است و رحیم — گندم ندہد بار چو جو می کاری

(رومیؒ)

قانون تجاذب (LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالمگیر قانون ہے، نہ اس کی ضد قابلِ تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثناء ہے، کون شبہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لئے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا تو ہر کوئی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

"ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی"

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں، اور ان کے درمیان ایتلاف

یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلبی اور شر انگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو تھوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا خطور شروع ہو جائے گا، رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائے گی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگے گا اور تمہارے ذہن کی فضا ان سے مملو ہو جائے گی، جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے، وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں، اور دنیا سے اپنی قوتِ فکری کا لوہا منواتے ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے، ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے، وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے اور نامعلوم و ناقابل علم منبع سے خیالات کا چشمہ ابلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لئے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے، قانون تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل تصورات کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے، ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی، یہ سب مبدء نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں اور مقرر کا ذہن ان کا قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں

حاصل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے تضمن و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصول مسرت اور تزکیۂ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو، اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے، فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا، اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آماج گاہ بنا لو تمہیں چاہیے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدء علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو حصنت نفسی بالحی القیوم الذی لایموت ابدا و دفعت عنها السوء بالف الف لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یا یوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون"، ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں، محض

---

ا میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اس ذات پاک کی مدد سے جو حی و قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرتی اور اپنے نفس سے برائی کو دور کیا، اسی کی حول و قوۃ سے یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

ذہنی طور پر یہ کہے جا سکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانونِ تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانون تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہو جاتے ہیں، ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، اور دفور قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوش گوار طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی اصلی علت ذہنی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریئے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSI TIUE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازیگاہ نہیں بناتا، جو ہر دم وساوس اور ہواجس کی نفی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدء یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا، ایسا قلب قوت کا مرکز ہوتا ہے، توانائی کا مبدء ہوتا ہے، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ کیسے شکار رہ سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا

نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات، منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضاء کو مضمحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لئے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دیا جانا چاہیے، ایجابی افکار کا مبداء حق تعالیٰ ہیں جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آگئے، اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضمحل اعضا میں توانائی آتی ہے۔ قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے! صحت کے حصول کے لئے اور اس کے قیام و بقا کے واسطے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہے، تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے "مماثل" خیالات کا ہجوم قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تاریک اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں تمہاری مسرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتش انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً

مسرت وطمانیت قلب کے لئے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود　　لقمہ ہر گربۂ دراں شود

(مثنوی)

اب اگر تم "دع اذاھم وتوکل علی اللہ (پ ۲۲ ع ۳)" پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کئے دیتے ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو، سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہو تو تمہیں ان تمام شر انگیز وفتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے، اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے۔ اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے مسرت میسر ہوتی ہے کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا، اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لئے تو کسی عارف نے کہا ہے۔

عالم تمام یک گل بے خار می شود
دل را از کینہ گر مصفا کند کسے

ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا ردِ عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ وغضب کے جذبات کا لازمی وجبری نتیجہ غم وحزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اسی طرح عفو واحسان ورحمت، کرم،

---

؎ چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر۔

صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت وطمانیت، توافق و الفت فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ علیت کے اس کلی عالمگیر، وجوبی دلزومی قانون پر یقین ہو جائے تو احسن الی من اساء[1] حکم پر عمل کرتے ہو ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تام المعرفت کے سریلے نغموں میں یوں کرتے ہیں،

ہر کسے در راہِ من خارے نہد من گل نہم!

او مزائے خار یابد من جزائے گل برم!

یہ سن کر اور مان کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے، بہر حال بشر ہوں اور فطرۃً مائل بہ شر ہوں، فطرۃً "ظلوم" ہوں، "جہول" ہوں، ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفاتِ عدمیہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جاسکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے ؎

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں     پھر وہی زندگی ہماری ہے!

(غالب)

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو آؤ ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہو گی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے اور جس کے خیال سے تمہارے

---

[1] جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

بدن میں سوزش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لئے تمہیں چاہیئے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

| | |
|---|---|
| وما اصابکم من مصیبۃ فما کسبت ایدیکم ویعفو عن کثیر (پ ۲۵ ع ۵) | اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو اللہ درگزر کر دیتا ہے۔ |

نیز

| | |
|---|---|
| انما ھی اعمالکم ترد علیکم (الحدیث) | یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جا سکتے ہیں۔ |

ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا کمایا ہوا ہے، اور اسی کے عین کا تقاضا یدٰک کسبتا وفوک نفخ[1] دوسرے کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے۔ جوں جوں تم اس صداقت پر غور کرتے جاؤ گے، تم پر واقعات کھلتے جائینگے اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم اپنی ہی کسی حماقت کو پاؤ گے! اگر سلسلہ تفکر کو چند روز جاری رکھوگے تو حقیقت اس قدر مبرہن ہو جائے گی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں، اور حق تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جا سکتی،

---

[1] تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔

ان اللہ لیس بظلام للعبید[1]۔

ہرچہ ہست از قامتِ ناسازی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اگر تم جذباتی انسان ہو، عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے، اور مذکورۂ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو:۔

"میں تمہیں (نام شخص) حسبۃً للہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین۔"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ تمہارے لئے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو نہیں، اپنے اس مجاہدہ سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا،

---

[1] بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اور ان کے لئے بخشش و عفو کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون بردِ قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کئے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریق اجتبا اپنی جانب کھینچ لیں گے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق ولے

راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است

ان ھٰذا لھو الفوز العظیم، لمثل ھٰذا فلیعمل العاملون[۱]۔ (پ ۲۳ ع ۶)

---

[۱] بیشک یہی مراد ہے بڑی مراد ملتی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔

# علاجِ خوف[1]

اس مختصر مقالہ میں میں نے ایک خونخوار جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد ماسوائے اللہ کا خوف ہے میں خشیۃ اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا معاذ اللہ یہ تو عین مقصود ہے، انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دوروزہ عمر پر ز خوف و خطر است | از غصہ غذائے خلق خونِ جگر است
آسودہ ولی ز بعد مردن ہم نیست | زیرا کہ خطرہ دراں طرف بسیار است

(ظہیر فاریابی)

انسان کی دوروزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے، اس کے

---

[1] یہ مقالہ موتمر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا اور پہلی مرتبہ معارف نومبر ۴۲ء میں شائع ہوا۔

قلب پر اس خونخوار جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزاں و ترساں اٹھتا ہے، اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی میں مل جائیں، جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے تو بے چین و پریشان ہو جاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے! کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے، کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صفوں میں شریک ہونا نہ پڑے ٹکڑوں کو محتاج نہ ہو جائے، رزق کا دروازہ بند نہ ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرا رہا ہے، یہ ناقابل برداشت نظر آرہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے! کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرا رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے، لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص

اس کا شکار رہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عماد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم را زِ من و مرا گریز از غم نیست | یارانِ قدیم را شکست از ہم نیست
غم خوی بمن کرد و من خوئے بغمم | ہمچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مردافگن قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیت خاطر اور بردقلبی کے ساتھ بسر کئے جا سکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکما نے کائنات کی کنہ و حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد و بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لئے ایک صلیب کے مانند ہے جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں و ترساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لاتخافوھم وخافون، ان کنتم مومنین (پ ۴ ع ۹) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق و مربوب شئے حقیقت میں نافع و ضار ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں ہو؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؟ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہو سکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض انھی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور ان زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی؛ پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) **علم کی تصحیح**:۔ خوف سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے تمہیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیئے، مذہب کی زبان میں یہ "عقائد" کہلاتے ہیں، ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے اور مذہب میں ان پر محض "ایمان" لایا جاتا ہے اور ورائے طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلاف تجربہ اور خلاف وجدان نہیں ہوتے، یہ مذہبی زندگی کے وہبی جذباتی حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں، دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کورانہ نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توافق پیدا کروگے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤگے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کروگے تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہوگے

حزن ویاس سے نجات نہیں ملے گی اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین وایمان کی شاہانہ قوت سے قطعی طور پر مان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدء خیر ہے، یہ مبدء حق تعالیٰ ہیں جو حکیم ہیں اور رحیم بھی! حق تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، جان کر کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہے، بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا وہاں کوئی شائبہ نہیں، ما صنع اللّٰہ فہو خیر ع

زنیکو ہر چہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائے گا تو جہت خیر تم پہ مبرہن ہو جائے گی خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگے گا، کمالات پر تمہاری نظر جائے گی، دل میں اور نظر میں، بصر میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائے گی، وہ عیب جو اور عیب بین نظر باقی نہ رہے گی جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے اور اس پر اعتراض کرتی ہے مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شر ہونے کا حکم لگاتی ہے اور وہمی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں کان بالمومنین رحیما، ان کا قول ہے وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، واللّٰہ ولی الذین اٰمنوا (پ ۳ ع ۲) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ

کس چیز سے ڈر سکتا ؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ بشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے تو اب وہ بہ یک جست خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان دماغ کو، معطل حواس کو، کچھ دیر کے لئے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز ہے، توانائیوں کا مبدء ہے اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کرو گے، تمہارا ضعف دور ہوگا، حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکین قلبی نصیب ہوگی،

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دار ہیں تو ظاہر ہے کہ ع

جہاندار داند جہاں داشتن

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے جو حکیم مطلق بھی ہے اور رحیم و کریم مطلق بھی ہے! اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لئے مضر نہیں ہو سکتا وہ بحیثیت مجموعی میرے لئے مفید ہے خیر برتر کے حصول کا ذریعہ، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں، کہ وہ مجھے

نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، درپے آزار ہیں، جب تھوڑے سے غور وفکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے علیم تو جمعیت تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے، اور خوف بالکل رفع ہوجاتا ہے!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہوجاتا ہے حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں وھو معکم اینما کنتم (پ ۲۷ ع ۱) جب مجھے اس امر کا تحقق ہوجاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں "اقرب" ہیں میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر وگزند سے محفوظ ہوں، جہاں بھی ہوں محفوظ ہوں، ان کے حفظ وامان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے دور ہوجاتا ہے، اور سرور واطمینان بلکہ ایک ذوق وستی پیدا ہوجاتی ہے!

در ہجر تو بودہ اندوہ وآزارم　　　از وصل تو رفت ہستی وپندارم

شادی آمد ونصیب جانم شد　　　اکنوں جان وتن خویش را براحت دارم

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علو سے تمکین حاصل ہے، "انتم الاعلون واللہ معکم" کا مصداق ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شئے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شئے کی نہ خواہش ہے اور نہ اس کے

نہ ملنے کا غم، جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں،!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہو، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیشِ نظر رہے ہوں۔

تشنۂ او میر گر تو زندہ ۔۔۔ خاک آں در باش گر تو بندہ

ذرہ دردِ خدا در دل ترا ۔۔۔ بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی معبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہمیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں مونس ہیں، غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور حزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے۔

اگر تم خوف سے بالکلیہ رہائی کے خواہاں ہو، اس کی بیخ و بنیاد کو صحنِ دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو "جمعیت تامہ" کے حصول کے خواہشمند ہو تو خود شناس بنو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ،

اس عرفان کا آلہ محض عقل نظری نہیں، اس کے لئے اس عقل کی ضرورت ہے جو بقول اقبال "ادب خوردۂ دل" ہے، عقل نظری (قیاسات عقل یونانی) تمہیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تر اوہام باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی، اور پھر اس کو بگاڑتی رہتی ہے یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمہیں لذت حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں،

انجام خرد ہے بے حضوری　　　ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

(اقبالؒ)

تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیئے جو "پیر رومؒ" کی ہدایت کے مطابق تم کہہ رہے ہیں،

<u>عقلے بہم رساں</u> کہ ادب خوردۂ دل است

یہ عقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بو علی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کرکے "سخن محمدیؐ" سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخن محمدی بند　　　اے پور علی ز بو علی چند

(حکیم خاقانی در تحفۃ العراقین)

اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نور وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھا رہی ہو، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی عبدیت کا علم ہو جائے گا کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجاً مخلوق ہو، غیر ذات حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن ہیں

اول وآخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب واقرب ہیں تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت وارادے سے قدرت وارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفاتِ وجودیہ تمہارے پاس امانت ہیں یہ تمہارے لئے اصالۃً نہیں امانۃً ہیں، تم فقیر ہو اور امین، امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو، تو ولی اللہ کہلاتے ہو، یہی چار اعتبارات ہیں، عبداللہ کے، فقر، امانت، خلافت، ولایت، عبداللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت واینت ہے، صفات وافعال ہیں، ملک وحکومت ہیں[1]، عبداللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرور محض ہے، اس لئے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابلِ بیان سرور محسوس کرتا ہے، طمانیتِ محض وذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف تام المعرفت نے ؎

چوں بدانستی کہ ظلِّ کیستی | فارغی گر مردی وگر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش | بگذر از غم دائماً مسرور باش

(رومیؒ)

---

[1] توضیح کے لئے دیکھو مصنف کی کتاب "قرآن اور تصوف"۔

انسان اپنی اس حقیقی جہت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف و حزن اس کے قلب پر محیط اس لئے ہیں کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں، اس لئے ہر درد و غم، ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل، اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی ؟!

یک سبد پر نان ترا فرق سر | تو ہمی جوئی لب ناں در بدر!
تا بزانوئے میانِ قعرِ آب | وز عطش و زجوع گشتستی خراب

(رومی)

(۷) علم صحیح کا استعمال - جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و باطن ہیں، جب تم کو یہ یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو،

الیس اللّٰہ بکاف عبدہٗ ویخوفونک بالذین من دونہ (پ ۲۴ ع ۱) | کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں؟ کیا تجھ کو یہ لوگ ان سے ڈراتے ہیں جو خدا کے ماسوا ہیں؟ (ترجمہ)

ہمیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے تم اس سے

کہتے ہو ڈرو مت یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس طرح خوف کی نفی کرلنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیئے جو سچ ہیں، مثلاً تم کہو گے میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یہ یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیئے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیئے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی تم جانتے ہو کہ یہ شیخی نہیں، واقعہ ہے، حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں، جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں حقا علینا نصر المومنین جس پر وہ ستر ماؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کائنات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مربوب ہیں، محکوم ہیں، مملوک ہیں، جب تک خالق و حاکم و مالک و رب نہ چاہے یہ ہمیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے الحکم للہ، متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضۂ قدرت میں تمام جانداروں کی پیشانی کے بال ہیں ما من دابۃ الا ھو اٰخذ بناصیتھا۔ ڈرنا ہمیں ان ہی کے

جلال سے، نافع وہ ہیں اور ضار وہ، معز وہ ہیں اور مذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ولو جهد العباد ان ینفعوک بشئ لم یقضه الله لک لم یقدروا علیه ولو جهد العباد ان یضروک بشی لم یقضه الله علیک لم یقدروا۔[1]

اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے۔

اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیئے! اور زندگی کا یہ عجب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیال ؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن

---

[1] اس حدیث کا ایک حصہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رض سے مروی ہے اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح فتوح الغیب مقالہ ۴۲ میں پیش فرماتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہیئے کہ اس حدیث کی اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور جمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

شیروں نے انھیں چھوا تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ حضرت دانیال ؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انھیں چھو نہ سکے، یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سنیاسی جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں، جہاں ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لئے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے، کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا!

نفی کے بعد اثبات، یعنی نفس کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہیئے جس طرح کے چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے جب وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے داہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ میں محصون ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جاتا ہے (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھیر سکتی ہے؟) سرور و طمانیت حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں ہونے لگتا ہے، وہ قطرۂ نور بن جاتا ہے، سراپا نور ہو جاتا ہے، اور مسرت دائمی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

اس مقصود کے حصول کے لئے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرانا بڑی مدد دے گا، جب خوف وہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں اور وہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیئے، اور آہستہ سے لیکن استقلال وثابت قدمی کے ساتھ معیتِ حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیئے،

حسبی اللہ نعم الوکیل ونعم المولیٰ ونعم النصیر۔

مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کارساز ہے، کیا خوب مولیٰ ہے او(ر) کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے، اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلب انور پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے،

یا حی یا قیوم برحمتک استغیث۔

صدق بھرے دل سے الغیاث کی یہ پکار نکلی کہ حی القیوم کی رحمت نے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فراہم کر دیئے!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر رہ کر کرنا ناممکن ہے جس

سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہیئے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے اور بالاتر سطح پر قدم جمائے دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلاخیز موجوں کے شور و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پنجے سے باہر ہیں بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور اس مقام پہ پہنچ جاتا ہے جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ!

یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد والم خوف و ہراس کے وقت اپنے رخ کو حق تعالیٰ کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرتِ ما دوستی یکدله کن ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یله کن
یک صبح باخلاص بیا بر در من گر کار تو بر نیاید آنگه گله کن!

(ابو سعید مہنہ)

---

# علاجِ حزن[1]

بے خلش ہا زیستن نا زیستن　　　باید آتش در تہِ پا زیستن
زیستن ایں گونہ تقدیرِ خودی است　　　از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است

(اقبالؒ)

ابتلا یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لئے یا فنا کر دیئے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے، یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہو خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے اور ابتلاء کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص و عام رحمتوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے، اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و جوبی

---

[1] یہ مقالہ ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد، نومبر ۴۳ء کے اجلاس نظام آباد دکن میں سنایا گیا۔

قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ماز سوزِ ناتمام است | چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل | تپیدِ یک دم و مرگِ دوام است

(اقبال)

اپنے اس دعویٰ کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لئے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں اور کائنات و فطرتِ انسانی کے چند کلی و ضروری قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں، ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد!

انسان! احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقید ہی سے احتیاج پیدا ہوتی ہے، یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجت مند ہے، فقیر ہے اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے،

عالم ہمہ دردست و دوا می خواہد | از خوانِ کرم برگ و نوا می خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن | در فیش غذا شہ اشتہا می خواہد

(سحابی استرآبادی)

اب اس عالم اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دی جاسکتی ہے مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کئے جاسکتے ہیں

جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علیحدہ ہو کر تارغ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم انھیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعویٰ کی تائید کریں گے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنیٰ میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں، ان کا ایقان ہے کہ کائنات کا مبدءٔ حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمران ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت ان ہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے اور ہر رنگ میں انسان جو جلتا رہتا ہے، اس میں کونسی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان ہے کہ اہلِ ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے، اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کی جا سکتی ہے،

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا ذمائمِ اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآنِ حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے،

| | |
|---|---|
| وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم ویعفوا | تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے ہے |

عن کثیر۔ (پ ۲۵ ع ۵) اور بہت سے تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے،

اولما اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیها قلتم انی ھذا قل ھو من عند انفسکم۔ (پ ۴ ع ۸)

اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے دو چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے ہی طرف سے پہنچی۔

صاحبِ کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ انما ھی اعمالکم ترد علیکم۔[1] یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں، قرآن وخبر سے اس راز کو معلوم کرکے حکماء و صوفیائے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

ان جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون، فان الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامة۔
(شیخ ابو النجاء)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اسی لئے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شئے ٹیڑھی ہے تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی

---

[1] انما ھی اعمالکم احصیھا علیکم فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیرھا فلا یلومن الا نفسہ۔

سیدھا ہوگا جس نے توقع کی کہ ٹیڑھی شئے کا سایہ سیدھا ہو تو اس نے محال کی تمنا کی من طلب استقامۃ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال اس لئے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھائے جا رہا ہے، یہ نتیجہ ہے تمہارے اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے وہ ایک روز تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائے گا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار سے کام لیا جائے اور دیانت فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللوم علی لا علیہم ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن، میرے ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں، ع

زادۂ طبع من اند آنانکہ خصمانِ من اند

(خاقانی)

اور حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگے گا۔ اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! درد

والم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے یداک کسبتا ونوک نفخ ۔

جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولِ بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بیکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے۔ جزع و فزع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقامِ شکوی میں داخل ہو جاتا ہے اور مقامِ صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہامِ باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم والم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں سرایت کرنے لگے گا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ ان کا وجود اسرارِ کائنات میں بے معنی نہیں، شرِ محض نہیں۔ یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لے جانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کے لئے ضروری ہیں، اقبالؒ نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

جہاں ما کہ جز انگارۂ نیست — اسیرِ انقلابِ صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد — ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

سوہانِ قضا پیکرِ خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو، غم والم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

(۲) بعض دفعہ درد والم، سوز و غم، معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کئے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکثیر و تجیص ہوتی ہے، شہوتوں ولذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الٰہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم، سوز والم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو جلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اس کا رخ پھیرتے ہیں، جو نور مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر تطہیر کے لئے کوئی اور شئے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر ع

این بلائے دوست تطہیر شما است (رومیؒ)

اسی مقصود کے پیشِ نظر عارفِ روم درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لئے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں      تازہ باش و چیں میفگیں بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو      آں صلاح تست آیس دل مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق تعالیٰ کے

انعامات سے بہتر قرار دیا ہے، آلام محبوب بہ از انعام محبوب، بلا ہی عطا ہے اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است واز عطا نالیدن خطا است،

کے ز آزار تو بیزار شود جانِ حسینؔ — زخم چوں از تو رسد با ہمہ آزار خوشیم

(منصور حلاج)

بلا و غم جب تکفیر و تمحیص کے لئے آتے ہیں تو اس کی صاف علامت یہی ہے کہ مبتلا جزع و فزع نہیں کرتا، صبرِ جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت کو پیش کر کے شکوہ و شکایت نہیں کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لئے بھی نہیں آتی بلکہ ارتفاع درجات اور بلوغِ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنھوں نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفیٰ ہیں، جنھیں ربط بحق قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ البلاء للولاء، بلا دوستوں کے لئے ہوتی ہے، مشہور خاص و عام یہی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

اذا احب اللہ عبدا ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ

یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لئے حضرت معروفؒ فرمایا کرتے تھے،

لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ بضرب مولاہ۔ | جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہیں لیتا وہ وہ سچا غلام ہی نہیں۔

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلے نغموں میں ادا کیا ہے۔

جاں بلب آمدم ز درد کردہ دم از دوا طلب | گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب

یار دمے کہ بر سرت تیغ زند تو دم مزن | سر بفدائے یار کن ہیچ نہ خونبہا طلب

محو رے مرادِ یار شو تا شود او بکام تو!

قابلِ التفات نیست عاشقِ مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاءات وقابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازل عالیہ تک رسائی کے لئے درد وغم لابدی ولازمی ہے، تقیید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد والم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے، ذمائم اخلاقیہ، تحدیدہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں، تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا ہے اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد وغم کو وہ فطرتاً مکروہ سمجھتا ہے لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ:۔

عسی ان تکرھوا شیئا | یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے

ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً۔ | اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لئے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انھیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انھیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیاء ہ۔

عشاق بلا کی اہمیت و قیمت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ وار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ

درد و قدح درد کہ آں می باید | درد یکہ زتست بیشتر می باید
تلخست عجب لیک بسے خوشخوار است | ہر چند ہمی خورم دگر مے باید

کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں:۔

بفقر و نیستی یک دو روزہ خوش می باش
کہ یار خود ز کرم عذر خواہ می گردد!

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر "کوئے جاناں" کی وجہ سے ہے، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جاناں کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے کیف اندوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت!

اسی لئے بلا میں یہ عوام کالانعام کے خلاف:۔

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہیں ہوتے اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انھم لن یغنوا عنک من اللہ شیئاً۔

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند | گرہ ز جبہ کشادند و بر زباں بستند

(۲) اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انھیں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں،

بادرد بساز چوں دوائے تو منم  |  در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی  |  شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

(۳) انھیں یقین کامل ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لئے اختیار کی ہے وہی ان کے لئے دین و دنیا میں اچھی ہے، ع

صلاح ما ہمہ آنست کاں تراست صلاح

"حدیث الولی" میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کر سکتی اگر میں اس کو فقیر کردوں تو یہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کردوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کردے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو بیمار کردوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کردے مجھے اپنے بندوں کے احوال سے پوری آگاہی ہے اور میں ان کے مطابق اپنا انتظام کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسنِ تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں اور ہر حال میں رضا بالعطاء، اور "حفظِ حال" ضروری سمجھتے ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اسی لئے گو وہ "طبعی" غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور" سے اون کے قلب خالی نہیں ہوتے، یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدوں کی جمع کا یہ ہنر" ان ہی کو آتا ہے، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ع

عالم ہمہ درد است و دوا می خواہد

یہ درد یا تو گناہوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لئے وارد ہوتا ہے، یا رفع درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، بہرحال،

| | |
|---|---|
| لقد خلقنا الانسان فی کبد (پ ۱۵ ع ۳۰) | ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔ |

کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ میں گزرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی میں پیچ و تاب ہے، چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے،

چہ پرسی از کجا یم چیستم من؟ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بیقرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا درد و غم سوز و الم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوت حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیش نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف رومی نے فرمایا تھا ؎

چوں بدانستی کہ ظلِ کیستی　　فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش　　بگذر از غم دائماً مسرور باش

فافہم و تدبر!

# علاجِ حزن[۱]

(مسلسل)

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارھویں اجلاس سنہ ۴۲ء
میں پڑھا گیا تھا

---

اگر غم را چو آتش دود بودے — جہاں تاریک بودے جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی — خردمندے نیابی شادمانہ

(شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سرتاپا احتیاج ہے، لہذا انسان غم کا مبتلا ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد، رفع احتیاج ہی کے لئے وہ شب و روز حیران و سرگردان رہتا ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لاتا ہے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے، ایک احتیاج کی

---

[۱] معارف میں بعنوان "زندگی میں غم کیوں ہے" کے عنوان سے جنوری سنہ ۴۴ء میں شائع ہوا۔

تشفی ہوتی ہے تو دس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں، اور غم والم برابر جاری رہتا ہے، لہذا کلیہ یہ قرار پاتا ہے :-

عالم ہمہ دردست و دوا می خواہد | از خوانِ کرم برگ و نوا می خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن | درویش غذا شد اشتہا می خواہد

(سحابی استرآبادی)

اس کلیہ کا استثنا الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے، جس کسی سے پوچھیے "میانِ دل چیست؟" جواب ملے گا، "درونِ سینہ سوزے و تفے!" اگر پوچھا جائے "تن چیست؟" کہے گا:- "غم و رنج و بلا راہ ہدفے"۔ کسی اور سوال کا انتظار کئے بغیر خود کہہ اٹھے گا، القصہ بہ قصدِ جان ما بستہ صفے، مرگ از طرفے و زندگی از طرفے،

دل چیست؟ درونِ سینہ سوزے و تفے | تن چیست؟ الم و رنج و بلا راہ ہدفے
القصہ بہ قصد جاں ما بستہ صفے | مرگ از طرفے و زندگی از طرفے

(مومن یزدی)

مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کلیہ بھی مسلمہ ہے کہ ہر مرض کا علاج ہے، غم کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لئے آپ میرے ساتھ چند نسخوں پر غور کیجیے ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لئے اور دوسروں کے لئے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، پدرانہ نصیحت کے لئے نہیں کھڑا ہوں چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقل روشن کو متوجہ کردوں گا، اگر یہ

اصول آپ کی سمجھ میں آجائیں، اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہوجائیں تو شفایابی یقینی ورنہ تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں، غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے، اس علاج کے مختلف اجزا ہیں، پہلا جزو:

**(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین:** ۔ اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں، (اور اسی صورت میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیر مطلق ہے، خیر محض ہے، نیز وہ ہمہ تواں یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شئے کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبدا خدا ہے، اس لئے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر معاذ اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا، اگر خیر مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائیے مقدمات کے صحیح ماننے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے،

ہر چہ بینی محض خیر و حکمت است — گر تہ از در رحمت و گر زحمت است
زانکہ ناید فعل باطل از حکیم — فعل حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہلِ عقل کے لئے دی ہے، اہلِ عشق جن کی صفت "یؤمنون بالغیب" ہے مبدء کائنات کو خیر محض مانتے ہیں اور اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انھیں راسخ یقین

ہوتا ہے، علاج غم کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "اللہ مستی وخود گزینی" کی وجہ سے آپ بہ یک وقت حسرت قنوطیت، یاس، غم واندوہ کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لئے رنج والم میں گرفتار رکھے گی، اقبالؔ کی تہدید بھول نہ جائے!

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

جب ہم یہ یقین کر لیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں شادمانی وکامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا، جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط ویاس خوف وحزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوائے عملی کو مفلوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیہ رو ہونے میں باقی کیا رہتا ہے، کیوں کہ نفس کا

یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا تعین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے جب اس کو اس امر کی یافت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے، اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے! آفات کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھیرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بیوقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہوسکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائق عبادت کیسے ہوسکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے۔ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے۔ اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑے گی اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدء قرار دینا پڑے گا ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم جرأت کے ساتھ یقین کرلو کہ دنیا اچھی زندگی اچھی اور اس کے واقعات و تجربات اچھے، نقص، کجی، یا شر کہیں ہے تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضا سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ

آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیوں کہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے، اور اپنے کو بے خطا و بے قصور قرار دو گے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سوء کا مبدا ہو کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاحِ نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو، اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ معروف رہتا ہو اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے

اقبال ایسے ہی بدبخت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے،

از جورِ چرخ ناہنجار تنگ	جام تو فریادی بیدار سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا	سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات	لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہاں تازہ شو	شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن	ہست در میداں سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار	با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را	میدہد ترکیبِ نو ذرات را
میکند از قوتِ خود آشکار	روزگارِ نو کہ باشد سازگار

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہیئے اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیئے، یقین کہ زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جا سکتا ہے۔

(۲) عمل:۔ مبدءِ غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم واندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتی ہیں، اور وہ محض چین و راحت کی زندگی بسر کر سکتا، عمل کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے، ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ناکامی سے یہ مایوس ہو کر نالہ و فریاد، سینہ کوبی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند تیقنات و عقائد ہیں، ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائے گی۔

مجاہد زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدان کارزار کا

جدال و قتال اس کے نزدیک "جہاد اصغر ہے" اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا، اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلا کے لئے جہاد کرتا ہے اس لئے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے، کان حقا علینا نصر المومنین اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساس کمتری" یک لخت اس سے مفقود ہوجاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ! وہ صرف اللہ ہی کو فاعل اور موثر حقیقی سمجھتا ہے اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے اور اسی کے سامنے سر عبودیت خم کرتا ہے، ذل و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، اپنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے اور نہ ان کے سامنے سر نیاز جھکاتا ہے کفی باللہ وکیلا۔ اس کا ماٹو ہے فاتخذہ وکیلا۔ اس کا اصول عمل قل اللہ ثم ذرھم اس کا طریقہ کار حسبی اللہ اس کا راحتِ جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موحد ہوتا ہے، اور لا الٰہ الا اللہ کا مصداق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامی، کامیابی میں وہ "شکر" کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس راز سے واقف ہے۔

(جو ایک مسلمہ نفسیاتی اصول پر مبنی ہے) کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیر کائنات آسان ہو جاتی ہے، لئن شکرتم لازیدنکم کا قطعی وعدہ اس کو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن یہ محض بمنزلہ اسباب و آلات و ادواتِ نعمت ہوتے ہیں، قاسم و مجری و موجد و فاعل و مسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لئے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لے کر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے منعم حقیقی اللہ ہے العاطی اللہ۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ۔ اس ادراک سے نعمت زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے!

| | |
|---|---|
| النعمۃ وحشی فقیدوھا بالشکر۔ | نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھو۔ |

یہ تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ

لئن شکرتم لازیدنکم۔

موحد جب اپنی جد وجہد میں ناکام ہوتا ہے تو یاس و حزن، خوف و الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے

واقف ہوتا ہے جو دفع غم کے لئے اکسیر ہے، اور جس کو "بصیرت محمدیہ" نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں مبدل ہو جاتی ہیں، ذرا نفسیاتی نقطہ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلہ اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشتت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، "گلہ و شکوہ" تو نامردی کی صریح علامت ہے "کلبیت" استہزاء و استخفاف غم کی وارد نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بار غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے، اور وہ انھی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے۔

خود بلاؤ ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے۔ یہ بظاہر شر ہے، لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعات زندگی کے ذریعہ معلم حقیقی ہمیں ہر روز سبق دے رہا ہے۔ اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں بھی ایک

حکمت ہے اور ایک خاص عظمت سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شئے ہیں نہ یہ درسِ حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کر سکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے، ایک اہم سبق سکھائی ہے۔ اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شئے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لئے ایک صبار فتار مرکب ہے، جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر تمہیں بالکل ہی مغلوب کرلے، اور اس کے خیر اور فوائد کے جز سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھ سکے، تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملے گا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کرے گا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومنِ صابر کے حق میں وارد ہوئی ہیں اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائے گا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ۔ دردمند صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے کیوں کہ ان اللہ مع الصابرین اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد وغم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چبھن کو کم کر دیتا ہے، اور وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا۔ کا حکم اور بشارت تو اس کو رقص میں لے آنے کے لئے کافی ہے! مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سر بازار ۹۹ تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سواں تازیانہ لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی! پوچھا

گیا کہ اس آخری تازیانے پر آہ و بکا کیسی ؟ کہا جس کے سبب مار کھائی ہے وہ ۹۹ تازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لئے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا! ؎

بادرد بساز چوں دوائے تو منم ‏ در کس منگر آشنائے تو منم

گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی ‏ شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

(جامیؒ)

صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ بلا از دوست عطاست و از عطا نالیدن خطاست البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا اولیاء کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ جزع و فزع کا،

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند

گرہ ز جبہ کشادند بر زباں بستند

سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہے اس کے سوا کچھ نہیں ؎

تسلیم نمی شوی از اں غم گینی،

تسلیم شو ہر آں چہ آید پیشت،

رضا بالعطا اور حفظ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے، اور

فرح و سرور کے دروازے کھل جاتے ہیں بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

آنانکہ رضائے حق بجاں می جویند ۔۔۔ در راہِ رضائے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آں کند کہ حق فرماید ۔۔۔ حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

قال علیہ السلام ان اللّٰہ رجالا یرضیٰ برضاہم و یغضب بغضبہم کما انہم یرضون برضاءہ و یغضبوا بغضبہ ؎

ہر چہ خواہی آں کند گر ہر چہ خواہد آں کند
انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

اے درد! تو بھی کیا نعمت ہے، تیری برداشت نے مجھے کیا سے کیا کر دیا! ؎

دردہ قدح درد کہ آں می باید ۔۔۔ در دیدہ زلست بیشتر می باید
تلخست عجب لیک بسے خوش خوارست ۔۔۔ ہر چند ہمی خورم دگر می باید!

# علاجِ غضب[۱]

یہ مقالہ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس
نومبر ۱۹۴۲ء میں پڑھا گیا

تا نتوانی خستہ مگرداں کس را | بر آتشِ خشمِ خویش مستای کس را
گر راحتِ جاوداں طمع میداری | می رنج ہمیشہ ومرنجاں کس را

(عطار)

انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں جو شئے سب سے زیادہ مانع ومزاحم نظر آتی ہے، وہ جذبۂ غضب ہے، اس آتش فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہیں آتا، بلکہ وہ ایک مہیب غار کا منظر پیش کرتا ہے جو دخانی آگ سے پُر ہے، جس میں سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لئے اہلِ غضب اپنا نسب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ خلقتنی من نار۔

---

[۱] معارف میں "قرآن اور علاجِ غضب" کے عنوان سے فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

ترا باچنیں تندی و سرکشی  نہ پندارم از خاک از آتشی

ایک غضب ناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسنؓ نے خوب فرمایا تھا کہ "اے شخص تو غصہ میں اتنا اچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب کی اچھال میں تو دوزخ میں جا پڑے گا"۔ اس قابلِ نفرت جذبہ کے تسلط کے وقت، انسان کی صورت پاگل یا درندے کی سی ہو جاتی ہے۔ دماغ اور اعصاب سیاہ دخانات سے بھر جاتے ہیں، نورِ عقل تاریک ہو جاتا ہے خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی، دوستی اور محبت کے پاک رشتے۔ قرابت و رحم کے مقدس تار، عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاش پاش کر دیئے جاتے ہیں، تندخو کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنون کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوز و تپش لکھی ہوئی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے اس جہانِ فانی میں شادماں زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزا تو ہیں، صحیح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن، تندخو ان دونوں سے محروم! اس کی سیاہ بختی و سیاہ روئی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش بقسمت ہر تند خو بود
برق از زبانِ حال مرا جستہ جستہ گفت

غرض غضب کا جذبہ ہر برائی کی کنجی ہے (حضرت جعفر صادقؒ). بیوقوفی کی جڑ ہے، مسرت وشادمانی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لئے جب بنی نوع انسان کے محسن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی وامی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لئے ذرا سا عمل تبلادیجئے تو آپ نے فرمایا لاتغضبا، یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب ملا[1]، کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا[2]۔

قرآنِ کریم نے کاظمین الغیظ والعافین عن الناس کی تعریف کی ہے اور ان کے اتباع کی تحریص وتاکید۔

کیا اس خوں خوار جانستاں جذبے سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟ قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کئے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت ومجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے! انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے ؎

ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی ؟

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ "نیکی علم ہے" یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی

---

[1] رواہ البخاری۔ [2] رواہ احمد۔

کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو، تیقن کے درجہ تک پہنچا ہو جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے، اس کو زبانِ سنت میں "علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظوں میں ہوتا ہے، جن کی شکایت حافظؒ نے اپنی اس محلود الذکر شعر میں کی ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند

علم صحیح بہرحال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ چومتی ہے، جذبۂ غضب کی تعدیل کے لئے بھی یہ دونوں ضروری ہیں، اس لئے ہم یہاں ان ہی دو کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں۔

(۱) علم صحیح :- یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے اور اس کے تحفظ کا خواہاں و متمنی ہوتا ہے اور مکروہ شئے سے بھاگتا ہے اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبور ہوتا ہے جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذاتِ خود غصہ بری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظ حیات کے لئے ضروری ہے، استمرار نسل کے لئے ناگزیر ہے، تنازع للبقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا میں نسل انسانی کا بقا ممکن نہ تھا، جس طرح کائنات خارجی میں عنصر ناری ضروری ہے، اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے اسی طرح فطرتِ انسانی میں جذبۂ غضب بھی ضروری ہے۔ اس کے

فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں :-

(۱) تفریط :- یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے، امام شافعیؒ نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلانے سے بھی غصہ نہ آئے وہ "گدھا ہے" حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت برا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کرے، فحش کا ارتکاب کرے۔ اور وہ حلم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں؟ غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت اشداء علی الکفار قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا

قہر و لطف اندر محل خود نکوست ۔۔۔ جائے گل گل باش و جائے خار خار

(۲) افراط :- یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اُس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہلِ غضب کی فہرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا سچ ہوتا ہے کہ ع

قسایہ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال :- یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کے قہرمانی میں

ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہاں حمیت شرعًا واجب ہوتی ہے، وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہاں اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ؏

ہر کرا علم نیست او جہ دوست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے استیصال کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے اعتدال کی ہم غضب میں افراط و تفریط کو رفع کر کے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ خیر الامور اوساطہا۔

دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے، یعنی اس کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں[1]۔

(۱) ایک وہ جو سب کے لئے ضروری اور لازمی ہے، جیسے غذا، لباس، مکان، صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلۂ غضب ان کے تحفظ کے لئے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لئے یہ ضروری ہے، کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے، اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے، ورنہ وہ صفحۂ ہستی ہی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہئے، کیوں کہ یہ خلافِ

---

[1] مقابلہ سر احیاء العلوم باب غضب۔

فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شئے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جا سکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز، ظلم وستم ناروا ہے، اور بتکلف حلم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جا سکتی ہے۔

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں جو بعض کے لئے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لئے غیر ضروری جیسے صناع کے لئے آلات و اوزار اور عالم کے لئے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے، اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ و بن سے استیصال نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی، اور صبر کی خو پیدا ہو سکتی ہے، اور سختی صبر کا احساس کم ہو سکتا ہے۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں جو کسی کے لئے بھی ضروری نہیں، جیسے مال وجاہ، خدم وحشم، یہ عادتاً محبوب ہیں تو لیکن قطعاً داخل ضرورت نہیں، یعنی ضروریاتِ زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا، یہ "تعیشات محض" میں شامل ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابلِ استیصال ہے ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبدء

"حبِ اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبدء بھی یہی حبِ اشیاء ہے نیز تمام حمق و جہالت کا بھی مبدء یہی ہے، رفع غضب کے لئے سچ پوچھو تو تبدیل مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارف روم نے فرمایا تھا کہ انما التند بیر تبدیل المزاج، اس تبدیلی کے لئے تنقیۂ دماغ ضروری ہے جس کا انحصار تزکیۂ قلب پر ہے۔

اس کے لئے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجرید ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہاں تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بیقرار کرتی ہے تو مال تمہیں "مار" نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج و معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی! اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شئے صحت ہے یعنی درد و الم سے رہائی اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہو جاتا ہے اور تمہیں خوف ہوتا ہے کہ یہ کہیں اجل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابل طبیب تمہارے علاج

میں مصروف ہوتے ہیں، تیر بہدف نسخوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمہارا
درد بڑھتا جاتا ہے، اضطراب و اضطرار میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال
تمہاری جاہ و حشمت تمہارے خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال
کر رہے ہو، لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے
تم اپنی تکلیف اپنے درد میں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمہیں یاد پڑتا
ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا
وَّلَا نَفْعًا وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا۔ الفاظ تمہارے ذہن میں ہیں
معنی اس کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق
سے بے خبر تھے، اب شاید تمہیں پہلی مرتبہ روشنی نظر آ رہی ہے، جہل کی ظلمت دور
ہو رہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنیٰ کا تحقق ہو رہا ہے اور خود کو نفع پر قادر
پا رہے ہو، اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا ہے، پھر
تم مالک کس شئے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب
ترین جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھر کمی
نہیں کر سکتے، مال تمہیں اس لئے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے
راحت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب
مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کروگے؟
یہ تو محض ایک بار گراں ہے، اس سے تو کمر ٹوٹتی ہے، یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب
کیوں ہو؟ سچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی ملک کی ہے،
للہ خزائن السموات والارض (پ ۲۸ ع ۱۳) اور وہی اس کے حقیقی

مالک ہیں، لہ ما فی السموات وما فی الارض وما بینہما۔ یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے! سچ پوچھو تو تمہاری کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی وحمید ہیں، یا ایہا الناس انتم الفقراء الی اللّٰہ واللّٰہ ھو الغنی الحمید (پ ۲۲ ع ۱۶) حق تعالیٰ نے اپنی عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال ودولت تمہارے پاس امانت ہیں، تم امین ہو، اس سے زیادہ نہیں، مالک وحاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حقِ امانت کا احساس ہونا چاہیئے، استرداد امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالکِ حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیئے، جانتے ہو استرداد امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جاتی ہے اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں، تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھڑک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علم صحیح کے تحضر کا ہے کہ تم محض امین ہو مالک نہیں، مالک حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فریضہ ہے کہ تشکر وامتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کر دو، غیظ وغضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور ومسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی شرائط مقررہ کے

تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالک حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت، آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے، اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جل رہے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں، جہاں تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے کو امین جانا اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائط معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کر دی جاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہو جانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے وہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکم حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جاننے لگتا ہے ان الحکم الا للہ کا اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اس کو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلۂ غضب نہیں بھڑک اٹھتا، حب جاہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبۂ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر مجھ پر وجدان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیر محض ہے مالک نہیں مملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مربوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض تعقلی علم نہیں، وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال و جاہ خدم و حشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات ہیں جو غنی و حمید ہے جو

مولیٰ ورب ہے، جو مالک و حاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الٰہ ہیں، لا الٰہ الا اللہ، وہی معبود ہیں، اور مستعان اور ہم سب عبد، عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے، اور فقیر، اس کی یہ نسبت ذل وافتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے، کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلبِ مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب و مرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے،

رفت آنکہ بقبلۂ بتاں رو آرم — حرف غم شاں بہ لوح دل بنگارم
آہنگِ جمال جاودانی دارم — حسنے کہ نہ جاوداں ازو بیزارم

(جامیؒ)

اور تم اوپر یہ دیکھ چکے ہو کہ غیظ و غضب کی اصل ومنشا حبّ اشیاء فانیہ ہے، لا الٰہ الا اللہ سے قلب کا تزکیہ اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حبّ اشیاء فنا ہوئی اور اس حُب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۲) مجاھدہ:۔ اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، مجاہدہ علم کے قلب میں نفوذ سریان کے لئے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے تمہارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدبر ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے

اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں قلب کو سکون ہوتا ہے، دماغ افکار دنیوی سے نسبتہً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس ازلی و ابدی صداقت پر غور کرنا چاہیئے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اپنے تحت الشعور نفس تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہیئے کہ مالک حاکم حق تعالیٰ ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز انہی کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم انھی کے فقیر ہیں، انھی کے در کے سائل ہیں، وہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود، ان کو رکھ کر میں کسی چیز کا محتاج نہیں، میں غنی عن الشئ ہوں، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے :-

| | |
|---|---|
| لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم۔ (پ ۲۷ ع ۱۹) | تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو، اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ |

کیوں کہ :-

عالم بطفیل ماست موجود          مائیم ز کائنات مقصود!

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر و تدبر عمیق ہوتا جائے گا، تمہارا نقطۂ نظر بدلتا جائے گا، اور یاد رکھو کہ نقطۂ نظر ہی کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے، اور خودی کے انقلاب سے کائنات کے چارسو بدل جاتے ہیں ؂

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا　　عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

(اقبال)

اسی انقلابِ مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاء فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے اور غصہ کا مبنیٰ ہی مسمار ہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم، جانا، امانت میں تم نے خیانت کی، امین نہیں غاصب ٹھیرے، غاصب کو جہاں کہاں امن و چین لینے دیتا ہے، تم میں اور کائنات میں توافق نہیں تخالف و تنازع قائم ہو گیا، اب ہر واقعہ تمہارے غضب کو بھڑکائے گا اور تمہارے لئے سوہانِ روح کا باعث ہو گا، جب تم نے اپنا نقطۂ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا اور خود کو ان کا مملوک و محکوم، آداب امانت سے واقف ہو گئے، تو اب کائنات میں اور تم میں توافق پیدا ہو جائے گا، اس توافق کے بعد انبعاثِ غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نمی شوی ازاں غم گیتی　　تسلیم شو ہر آنچہ آید بیشیت!

اس لئے تمہیں دورانِ تفکر میں رضا بالقضاء کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے، دیکھو "مدبر امر" درحقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں یدبر الامر من السماء الی الارض، جب وہ مدبر ہیں، جب امر و حکم ان ہی کا چل رہا ہے، تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسنِ رضا درکار ہے نہ کہ غضب و غصہ! دیکھو حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل، اور خود ہی خالق (خلقکم وما تعلمون) تو اب بات تمہارے ذہن میں آجانی چاہیے کہ ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں کان بالمومنین رحیما۔ اب اگر تم میں ایمان ہے، اس کی حفاظت تم نے کرلی ہے تو اب ہر واقعہ تمہارے لئے بشانِ رحمت ہی پیش آئے گا، گو بصورتِ قہر کیوں نظر نہ آئے، کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمہارا نقصان روا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کروگے اور تمہارے قلب پر وہ مسلّط ہو جائے گی تو بے اختیار تمہاری زبان سے یہ پر ترنم الفاظ نکلنے لگیں گے۔

خواہی ز وصال شادماں دار مرا　　خواہی ز فراق بہ فغاں دار مرا
من با تو نگویم کہ چساں دار مرا　　زانساں کہ دلت خواست چناں دار مرا

(خیّام)

یہ مجاہدہ کا انجام ہوگا، لیکن اس غایت کا حصول یک دم نہیں ہوتا، تمہیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے، اور ہمت و استقلال سے قدم بڑھائے جانا چاہیئے، کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے اور کان حقا علینا نصر المومنین کا وعدہ اس لئے پورا ہو کر رہتا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
دوست دارد دوست ایں آشفتگی　　کوشش بیہودہ بہ از خفتگی
کار کے کن تو و کاہل مباش　　اندک اندک خاک چہ را می تراش
چوں ز چاہے می کنی ہر روز خاک　　عاقبت اندر رسی در آب پاک
چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے　　عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

# کامیاب زندگی کا قرآنی تصور[1]

تقصیر مکن دانۂ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرۂ زیبا سے ذرا نقاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خط و خال نظر آئیں اور ہم چیخ اٹھیں ہ

دستے کہ بیکرہ تو بدیں آب و تاب ریخت گر در ہست بر آئینۂ آفتاب ریخت

(بیخود موہانی)

ورنہ بقول عرفی "خواب نا دیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہو گی۔

کامیابی کا لفظ اپنا آپ مفسر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو تو وہ کھیل کود، تماشا، لہو و لعب ہی کو مقصود زندگی قرار دیں گے، لیکن جب یہ بچپن کی منزل سے

---

[1] مطبوعہ معارف ۱۹۴۳ء۔

گزر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زیب و زینت و آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایتِ حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "اقدار" سے بالاتر! التباس کا یہ زمانہ بھی گریز پا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہشیں سمجھنے لگتے ہیں جب ان کی عقلوں میں پختگی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں،

اے آنکہ تمام آرزو ہوسی — طفلی مستی مخبطی خود چہ کسی!!

(رفیع واعظ)

اب زینت و آرائش سے زیادہ ٹھوس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں، وہ مال و دولت کے تکاثر، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں اور بچپن اور نوجوانی کی تمام آرزوؤں کو خبط اور مستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی یہ قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں، انھی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس ان کو پاکر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائیں گے، اطمینانِ قلب ان کو میسر ہوگی، اور راحتِ جاں نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گزرتے جاتے ہیں، رنج و راحت کی مقدار مقدار انھیں ملتی ضرور ہے، لیکن امل کی درازی، اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلواتی ہے،

شد عمر تمام و ناتمامیم ہنوز | در دوزخ حسرتیم و خامیم ہنوز
عمر یست کہ در راہِ طلب گام زنیم | ویں طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز

(مومن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم رکھ کر انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے ان کے تمام التباسات کو جاننے لگتا ہے، اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آبِ خوب کو خراب عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیاء کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گوناگوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے، ہوش ربا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستقل سمجھتی ہے، اس کی پرستش کرنے لگتی ہے اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں،

کان لم تغن بالامس!

احوال جہاں و اصل ایں عمر کہ ہست | خوابے و خیالے و فریبے و دمے است (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے،

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال و الاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما،

(پ ۲۷ ع ۱۹)

تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو ولعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی رح)

بہتوں کے لئے زندگی کا مقصود یا تو لہو ولعب ہے، یا زینت و تفاخر، یا تکاثر اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہوگا کہ اہلِ دنیا برترین اقدار یا تو لذت کو قرار دیتے ہیں، یا دولت کو یا شہرت کو اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ان اقدار کے تحقق میں کامیاب ہوتی ہے ہمیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان اقدار یا غایات کا امتحان کرنا ہے، ع

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی،

کیا لذت مقصودِ زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا ہم لذت اندوزی اور دل کی

خوشی کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہے، مسٹر ووڈ درس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے ہوتا ہے[۱]، اور فرائڈ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلۂ تناسل ہے، سائرینی مذہب کا بانی ارس تبوس لذت ہی کو مقصود حیات قرار دیتا ہے، اپنے پیرووں کو اس کی تلقین تھی ؎

ہمچو منت اعتقاد باید کردن    مے خوردن واندوہ جہاں نا خوردن

(خیام)

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اولین محرک جلب لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ لذت کو خیر برتر قرار دینے سے اپیکورس کی مراد کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے، بلکہ بدن کا درد والم سے اور روح کا پریشانی وغم سے نجات دلانا اس کے پیش نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے نجات ہو، دوستی و محبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تضمنات، اپیکورس کے خیال میں خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے ؎

تنکے مے لعل خواہم و دیوانے    سدِ رمقے باید و نصف نانے

---

[۱] اور انسان کی حالت مکھی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ حلوے ہی کی شیفتہ ہوتی ہے،

ہر جا کہ مگس بہ دیدہ بالا وچہ پست    جز شیفتۂ در بودہ حلوا نیست

(سحابی استرآبادی)

وانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے ‌ ‌ ‌ ‌ خوشتر بود از مملکتِ سلطانے

خود خیام نے جہانِ بیوفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحبِ تفکر جب عالم پر غور کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ؎

درعالمِ خاک از کراں تا بہ کراں ‌ ‌ ‌ ‌ چندانکہ نظر کنند صاحب نظراں

حاصل زجہاں بیوفا چیزے نیست ‌ ‌ ‌ ‌ الّا مئے لعل و عارض خوش پسراں

ایک روز مرنا ضرور ہے "بے مونس و بے حریف و بے ہمدم و جفت" قبر کے گوشے میں سونا ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ ہے کہ ع

ہر لالۂ پژمردہ نخواہد بشگفت!

تو پھر جلبِ لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ لذتیت کے اسی بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ؎

کم خور غم روزگار ناساز شدہ ‌ ‌ ‌ ‌ میخور زکف ساقی دمساز شدہ

کاں کز کس مادر آمد امروز بروں ‌ ‌ ‌ ‌ فردا بینی بکون زن باز شدہ

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ الفاظ کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہوگا وہی جو جلب لذت، و دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت و خوشی کا طلب گار ہے، اشیاء کا اچھا یا برا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رساں ہوتا ہے، وہ الم رساں و تکلیف دہ شے کو بری سمجھتا ہے اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی

صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کرکے کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈنی چاہیئے، لذت ہی کو اپنا مقصودِ حیات قرار دینا چاہیئے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہیئے، لذت ہی کو اپنی غایت قصویٰ قرار دینی چاہیئے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ

جہاں از پئے شادی و دل خوشی است نہ از بہر بیداد و محنت کشی است؟

یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پئے دل خوشی مگر کز پئے رنج و محنت کشی؟

فتفکروا و لا تکونوا من المستعجلین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا ابطال تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو جائے گا، دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبدء دراصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہاآت ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں، جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہٰذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل میں وہ اشیاء ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے،

نہ کہ مجرد لذت، دیکھو ہمیں پہلے بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی اول احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر نگلنے لگیں اور اس طرح دانتوں سے اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر کھودنے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریڈلے کے الفاظ میں نام ہے تحقق ذات یا تکمیل نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہاآت کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن یا روح دونوں کی ضروریات شامل ہیں، انھی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے؛ لہذا خواہش براہ راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی، لذت براہِ راست معروض خواہش نہیں، اور نہ بذاتِ خود ہمارے لئے قیمت رکھتی ہے، ہاں اس کو "مقیاس قیمت" قرار دیا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرمامیٹر کا درجۂ حرارت خود حرارت نہیں ہوتا بلکہ مقیاس الحرارت

ہوتا ہے، لذت ہر جسمانی وروحانی اقتضا کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے، لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لئے لذتیہ کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اگر ہماری یہ سیدھی سادھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو خود تجربہ کر کے دیکھو، لذت کو مقصود بالذات قرار دو اور اس کے حصول کی کوشش کرو، بہت جلد تم کو معلوم ہونے لگے گا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے اور ہر تجربہ کار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے (فلاسفہ اس کو "استبعاد لذتیت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں) کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بچ نکلتی ہے جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو، اتنی ہی کم وہ ملتی ہے، اور جس قدر بے پرواہ اس کی طرف سے ہوجاؤ گے اسی قدر وہ تمہارے پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیوے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں۔

جب جذبہ کا رجحان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان یا تو کلبیت اختیار کر لیتا ہے، اور سردوتی میں مبتلا ہوجاتا ہے، یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی پست اور درماندہ جذباتی فطرت کو اکسائے، اور اس میں نئے سرے سے جان ڈالے، اگر کوئی شخص محض حسی زندگی بسر کر کے اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے اور ان اشیاء سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پائے جاتے ہیں تو اس کی

قوتِ احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔[1]

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیہ اور اتباع ابیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لئے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی، اب، وہ بجائے حصولِ لذت کے دفع الم کو مقصدِ حیات قرار دینے لگے، ابیکورس کا یہ قول مشہور ہے،

جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شربِ مدام ہے اور نہ صنفِ نازک کی صحبت، اور نہ مرغ و ماہی اور قیمتی ماکولات سے آراستہ کئے ہوئے دسترخوان، بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے، اور ان بیہودہ خیالات و اوہام کو دور کرتا ہے جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں۔[2]

سچ ہے :۔

اصلاحِ مزاج از ضروریات است یک تنقیۂ دماغ می باید کرد !

(واقف)

ارس تی پوس کا مشہور پیرو ہگے سی یس (HEGASIUS) لذت کو

---

[1] نفسیات ص ۲۹۹۔

[2] دیکھو بیک ول کی کتاب THE SOURCE BOOK OF ANCIENT PHILOSOPHY ص ۳۰۰ مقابلہ کرو راقم کی کتاب فلسفہ یاس ص ۷۸۹۔

مقصود حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھلاتا ہے کہ باغ جہاں میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں، طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ درد ست و دوا می خواہد     از خوانِ کرم برگ و نوا می خواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن     درویش غذا، شہ اشتہا می خواہد

(سحابی استرآبادی)

جب لذت مقصود حیات اور وہ ناقابل حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا استخوان بے مغز ہے، عاقل اس استخواں کو کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحت جان پاتا ہے، موت ہی سے سارے درد و الم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم و ہم دور! ایجابی لذت ناقابل حصول، لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ لہذا،

با چرخ ستیزہ کار مستیز و برو     با گردش دہر در میامیز و برو
یک کاسۂ زہر است کہ مرگش خوانند     خوش درکش و جرعہ در جہاں ریز و برو

(امیر ابو اسحق)

یہ تھا استدلال ہگے سی یس کا، اور اتنی قوت و اثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خودکشی شروع کر دی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا! جو لوگ زندگی کا مقصد وحید لذت اندوزی اور ذائقیت کو قرار دیتے ہیں، انھیں اسی طرح استدلال کرنا پڑے گا۔

لذتیت سے قنوطیت کا ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہے تو بتاؤ کہ ؏

با محتسبہ مستورہ لذت چہ کند کس ؟

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایت قصویٰ قرار دینا چاہئے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے ؟

نہیں، لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیبات حیات کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوز نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا، اس کو موج سراب اور جوش حباب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا ؏

ان اللبیب بمثلھا لا یخدع

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہے، جانتے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرام جاں اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ روم کے ساتھ مل کر وہ لذتیہ سے کہتا ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

جب لذت مقصود زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہار خلق جاہ و مرتبت

نام ونمود وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنھیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطف کے لئے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد وغم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لئے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برترین ہے، مطلق قیمت ہے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس تنقیص کو فطرۃً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعًا پسند! بندہ ہونا اس کے نفس پر شاق ہوتا ہے ربوبیت طبعًا محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے، جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی "انا ربکم الاعلیٰ"، اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقول عارف روم، فربہ ہوتا ہے، ؎

چارپا فربہ شود از راہِ نوشش
آدمی فربہ شود از راہِ گوشش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردقلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے، ہوا پر، تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا خفیف سا جھونکا بھی ہمارے بیمارِ شہرت کے دل کے غنچہ کو شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم کرے گا؟ کیا ہوا پر اس کا اختیار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رخ کس طرف ہو گا؟ عوام کالانعام آج اپنے ہیرو کو اوجِ آسمان پر جگہ دیتے ہیں، اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ مذلت پر پٹک دیتے ہیں، آج تحسین و تصفیق ہے، اور کل زجر و توبیخ، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی یہ ہے المناک تجربہ تقریباً ان تمام پرستارانِ شہرت کا جنھیں عوام نے کچھ دن کے لئے بت بنا کر پوجا تھا، ولنگٹن واٹرلو کا فاتح اعظم نپولین کو شکست دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، بطل اعظم کا خطاب دیتے ہیں اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب آلود مجمع پتھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، جس کو ولنگٹن اپنی موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے جولیس سیزر ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، سکندر اعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن پڑی رہتی ہے اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو بھی کوئی نہیں ملتا یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گیرم پسر اکہ رستم وسام شدی — یا خسروئی نیمروز یا شام شدی
نہ زور بگور می تواں برد نہ زر — افسوس کہ کیمیائے اوہام شدی

(حضرت اللہ خاں نثار)

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سارے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے کا دعوی کرتا ہے، بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے، تو اپنے تکبر اور عزت کے گھمنڈ میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (پ ۲ ع ۹) جس شخص کا دماغ اس قدر الٹ جائے اس کو مسرت و طمانیت قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر قدم پر خلافِ طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا ہے اور کوئی حسد، کوئی اس کو "قطرۂ آب گندہ" کہتا ہے، اور کوئی "ظرفہ جانور" اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے بچ نہیں سکتی، شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہے، اور بقول عارف روم اس کی حالت یہ ہوتی رہتی ہے،

خشمہا و چشمہا و رشکہا!
بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزار دل

غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے اور خلق سے سوائے غم واندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے ان پر اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اساس پائدار اور مستقل ہے، فیا للعجب! خلق کے وعدوں سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں،

وعدۂ ارباب دنیا ہمچو خواب احتلام!
شب ہمہ شب عیش وعشرت باشد و فردا دروغ
(کلیم)

ایسے احمق پر ترس آتا ہے، مگر اس کے مقصود حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا،

نہیں! ہم محض حصول جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت وطمانیت پا سکتا ہے اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دیدۂ حق نہ رہے تو پھر اس میں پوست کے سوا رہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دید ست و باقی پوست ست　　دید آں باشد کہ دید دوست ست

(رومی)

سأصرف عن آیاتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق (پ ۹ ع ۷)　|　میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق نہیں۔

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبغوض ہو جاتا ہے انہ لا یحب المستکبرین! جب دید حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے میں باقی کیا رہا، انانیت، اپنی ذات سے محبت اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں، اجزا اس کی ہلاکت اور بربادی کے! اسی لیئے نفس انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم نے فرمایا تھا کہ

انما ھلاک الناس باتباع الھوی وحب الثناء۔　|　ہوئی و ہوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقہ سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاریان ارسلان فی زریبۃ غنم لیس باکثر فسادا من حب الشرف　|　دو بھیڑیئے حملہ کرنے والے جو بھیڑوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جائیں اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا کہ شرف اور

والمال فی دین الرجل۔ (مسلم)

مال کی محبت مسلمان آدمی کے دین میں کمرتی ہے۔

اسی "حب الشرف" سے ارادۂ رفعت یا ارادۂ علو پیدا ہوتا ہے اور جب تک انسان اس سے خالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوًا فی الارض ولا فسادًا والعاقبۃ للمتقین۔ (پ ۲۰ ع ۱۲)

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اس آیت کو مرتے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی۔

خوب سمجھ لو کہ ہم حصولِ کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد باکمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمالِ حریت یعنی شہوات وجذبات سے آزادی، دنیوی تردداتت سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات وافعال مالکیت وحاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ وحقیقی کمال سمجھتے ہیں اور ہمارے عقیدہ کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لئے مرنے کے بعد نور بنے گی۔[1]

---

[1] دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۱۹،

| | |
|---|---|
| نورھم یسعیٰ بین ایدیہم وبایمانھم یقولون ربنا اتمم لنا نورنا۔ (پ ۲۸ ع ۲۰) | ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا، یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے لیے اس نور کو آخر تک رکھ۔ |

اور جو اس نور معرفت سے بے بہرہ ہوں گے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریوں میں پڑا ہے۔

| | |
|---|---|
| کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا۔ (پ ۸ ع ۲) | اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں ہے، ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔ |

ہم اس جذبہ کی مذمت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لئے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی صورت میں سیدھے راستے کی تعلیم فرما دی تھی۔

| | |
|---|---|
| اللھم اجعلنی صبورا وشکورا واجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا۔[۱] | حق تعالیٰ مجھے صابر و شاکر بنا، مجھے اپنی آنکھوں میں صغیر رکھ، اور لوگوں کی آنکھوں میں کبیر بنا۔ |

---

[۱] یہ دعا حضرت بریدہؓ کی روایت سے سند بزاز میں ملتی ہے۔

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بے چارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت و جہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصّۂ وافر۔ یہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے۔

مقصود حیات اگر شہرت یا اشتہار خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہوگا کہ مال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے حصول کا، خود غایت نہیں، ہم نے ان غایات میں سے بعض پر اوپر بحث کی ہے، اور ان کو زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے ابطال سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئے، اور اگر جائز مقصدِ حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت ہے

مال را اگر بہر دیں باشی حمول
نعم مالٌ صالحٌ گفتش رسولؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی میں مقصود حیات کا تعین ضروری ہے

حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہان کی تخلیق کی غایت ہے صریح ارشاد ہے:-

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون[۱]۔

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہیں، لہٰذا وحدتِ ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہاں کا کوئی مقصود نہیں، ہر نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا،

| | |
|---|---|
| یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ۔ (پ ۸ ع ۵) | اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود درب نہیں۔ |

جامی نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے ؎

از زندگیم بندگی تست ہوس | بر زندہ دلان بے تو حرام ست نفس
خواہد ز تو مقصود دلِ خود ہر کس | جامی ز تو ہمیں ترا می خواہد و بس

زندگی کا مقصود برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی یافت ہے، ان کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہے یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت ہمارا جینا اور ہمارا مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

| | |
|---|---|
| قل ان صلاتی ونسکی | کہو کہ بالیقین میری نماز اور |

---

[۱] حضرت ابن عباسؓ نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے کی ہے۔

ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ و بذلک امرت وانا اول المسلمین۔ (پ ۸ ع ۷)

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے، اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں، اسی لئے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔

والذین آمنوا اشد حبًا للہ۔ (پ ۲ ع ۴)

اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم و برائے تو زیم

جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح بسر کرنے کا حکم دے رہے ہیں، پہلے اجمال پھر تفصیل۔

اجمالاً یوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا کام ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی انہی کے امتثالِ امر میں ہو، انہی کی رضامندی و خوشنودی کے خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی کے

لئے نہ ہو، عیش پرستی کے لئے نہ ہو، جاہ طلبی کے لئے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت اللہ کی ہو غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے ہر فعل کا تعین امر حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہے، اقبال کے تہدیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں،

وائے ما اے وائے ایں دیر کہن
تیغ لا در کف نہ تو داری و نہ من

دل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں
ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں مردن است ایں زیستن

مرد حق باز آفریند خویش را
جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفیٰ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو، قرآن میں متقیوں کی تعریف اجمالاً یوں کی گئی ہے۔

والذی جاء بالصدق     جو سچی بات لے کر آیا، اور

| | |
|---|---|
| وصدق به اولئک هم المتقون۔ (پ ۲۴ع۱) | جس نے اس کو سچ مانا، وہی لوگ پرہیز گار یا متقی ہیں۔ |

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملئکۃ والکتاب والنبیین واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا | کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر، اور کتب پر اور پیغمبروں پر، اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو، اور گردن چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی رکھتا ہو، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، |

والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس ، اولئک الذین صدقوا ، واولئک ھم المتقون

(پ ۲ ع ۶)

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب عہد کریں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

اس آیۃ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب منزلہ پر اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقویٰ کے اساس ہیں، عمل کا صدور ایقان وایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمال صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے، ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں، انفاق اقامت صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ، انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں سوال کرنے والوں کے لئے ہو، اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے، انفاق کی شرط مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت ہی میں خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی ورضا کی خاطر، اس لئے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں برتری حاصل ہو اخلاق میں ایفائے عہد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں۔

تقویٰ کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیش نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع ومانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچنا ہے ہر اس شے سے جس سے دین میں ضرر کا خوف ہو، محاورۂ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے[1] اس طرح دین کا تقویٰ نواہی سے اجتناب ہے، حضرت غزالی کی اس تعریف میں امتثالِ امور یا عبادت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ صرف اجتناب محظور یا گناہوں سے پرہیز ہی کی تاکید کی جا رہی ہے، منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور شبہات سے پرہیز انسان کے لئے پہلے آدھے حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، مبتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور دیتا ہے، اور کامل اہلِ بصیرت پرہیز کا حصہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے، کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں، لیکن اگر دونوں حصے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے۔[2]

---

[1] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۷،۵ (مطبوعہ نولکشور)

[2] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۱۱۸ و ۱۱۹۔

عبادت کے دونوں حصول کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے "تقویٰ کفر و شرک نفاق و بدعت[1] سے احتراز امتثالِ مامور، اجتنابِ محظور اور رضا بمقدور ہے، متقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اور امر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راضی برضائے حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس طرح ادا فرماتے ہیں[2]، لابد لکل مومن فی سائر احواله من ثلثة اشیاء:- امر یمتثله ونهی یجتنبه وقدر یرضی به، یعنی ہر مومن کے لئے تمام احوال میں تین

---

[1] احتراز کا ذریعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان ماننا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے اس اقرار سے شرک کا خروج ہوجاتا ہے، اور توحید داخل ہوجاتی ہے۔ جس ذاتِ پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہوجاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے، اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے، بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا جو دین کی بات نہیں ہے اس کو دین سمجھنا ہے، مجملاً شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان، نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت حاصل ہوتی ہے، (دیکھو باب دل، عبادت واستعانت۔

[2] فتوح الغیب مقالۂ اول۔

چیزیں ضروری ہیں، امر الٰہی بجا لائے، نہی سے اجتناب کرے، اور تقدیر پر راضی رہے، اتنی بات یہاں سمجھ لینا ضروری ہے کہ امر الٰہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریعی، یہاں وظیفۂ عبودیت یہ ہے کہ اس امر کو بجا لائے، اور امر منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضا کا اشارہ اسی طرف ہے، بالفاظِ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کرے، اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہیں، اول عبادت ہے اور ثانی "عبودیت" ایسی ہی زندگی تقویٰ کی زندگی ہے اور ہر معنیٰ میں کامیاب زندگی!

اب دیکھو زندگی میں کامیابی و سرخ روئی کے لئے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو نہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدت سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ خیر مطلق اور قدوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدء وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد و اذعان کی رو سے زندگی اچھی، اور زندگی کے تجربات اچھے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کے ساتھ تعاونِ عمل کرتا ہے، قنوطیت و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارف رومی نے کہا تھا انما التدبیر تبدیل المزاج[1]۔ آدمی

---

[1] تدبیر اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جائے۔

میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے[1]، مومن کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس وقادر وعلیم مطلق ذات کی تجلیات کا مظہر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہاں کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چار سوئے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں، اقبال کے اس گمان کو صحیح کر دکھاتا ہے ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

خالقِ کائنات و ربِ کائنات سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے اور انا عند ظن عبدی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا قول سچا ہوتا ہے، صادق مصدوق نے بھی تو اس کی خبر دی تھی، ان للہ رجالا یرضی برضاءھم ویغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہ ویغضبوا بغضبہ، بعض رجال اللہ ایسے بھی ہیں جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں اور جن کے غصہ سے وہ بھی غضب فرماتے ہیں، جس طرح کہ

---

[1] یہ جی، کے، رچسٹرٹن کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے۔

یہ مردانِ حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش ہوتے ہیں، متقی کی اسی شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے ؎

فارغ بنشیں وغم مخور وشاد بزی

این معنی لا الٰہ الا اللہ است!

مومن متقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنیٰ میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، انھی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس نے تقویٰ اختیار کیا، اس کے سارے ترددات رفع ہوگئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے، بات اصل تھی سو حاصل ہوگئی، اپنی تائید میں وہ قتادہؒ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا ہے کہ "اے فرزندِ آدم تقویٰ اختیار کر اور جدھر چاہ سو رہ۔" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں رہتا، مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ غوث اعظمؒ ساکن الجوارح، مطمئن الجنان، مشروح الصدر، منور الوجہ، عامر البطن، غنی عن الاشیاء۔ بخالقہا[1]، ہوتا ہے، لوگ اشیاء کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بالشئے ہوتے ہیں، مجاہد متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے

---

[1] ساکن الجوارح (بلا حرکت اعضاء) اور قلب مطمئن اور فراخ وکشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق خالق کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ۔ (فتوح الغیب مقالہ ٦)

وہ خود خالق اشیا کو رکھتا ہے، اس لئے وہ غنی عن الشئی ہوتا ہے اس کے ذل وافتقار کی نسبت حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاءؑ سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لا الٰہ الا اللہ کی شمشیر ہے، اسی لئے وہ فرمانروائے موجودات[لہ] ہے، اس فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت ملی اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی، اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لئے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

(اقبال)

تم دنیوی نقطۂ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دیتے ہو؟ وہی نہ جو آسمان و زمین کے برکات سے مالا مال ہو؟ دیکھو اس کی حصول ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے،

ولو ان اہل القریٰ
آمنوا واتقوا لفتحنا علیہم
برکات من السماء والارض۔
(پ ۹ ع ۲)

اگر ان بستیوں کے رہنے والے
ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے
تو ہم پر آسمان اور زمین کی برکتیں
کھول دیتے

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج و تعب ہوگا، نہ حزن و خوف۔

---

لہ ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا ست — جملہ موجودات را فرماں روا ست

(اقبالؒ)

| | |
|---|---|
| فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (پ ۸ ع ۱۱) | پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ حزن۔ |

کامیاب زندگی وہی ہے نہ جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے؟ بشرط تقویٰ اس کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

| | |
|---|---|
| ان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا۔ (پ ۴ ع ۳) | یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔ |

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب و منصور ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (پ ۱۴ ع ۲۲) | اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔ |

کامیاب زندگی وہ ہے نہ جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزق حلال ہو؟ دیکھو اسی کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے، مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، (پ ۲۸ ع ۱۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں، وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (پ ۲۸ ع ۱۷)

اخروی نقطۂ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے،

کیوں کہ وہ حق تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے،

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔ | حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔ |

ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (پ ۲۶ ع ۱۴) | اللہ کے نزدیک سب سے بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی یا پرہیزگار ہو۔ |

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| یا ایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم | اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ |

دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے۔

| | |
|---|---|
| وینجی اللہ الذین اتقوا بمفازتہم لا یمسہم السوء ولا ہم یحزنون۔ (پ ۲۴ ع ۳) | اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے ساتھ نجات دیں گے ان کو نہ تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ |

ان ہی کے لئے بالآخر جنت ہے اور سامانِ عیش وعشرت۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ (پ ۲۷ ع ۲)

متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور سامانِ عیش میں ہوں گے۔

بہرحال مومن متقی کے لئے دونوں جہان کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری، آرام وآسایش اور برکتیں، غم وخوف وحزن سے نجات، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی معیت ونصرت اور آخرت کی بشارت معاملۂ قبر حساب وکتاب کا آسان ہونا، یعنی جس وحساب قیامت سے رستگاری اور بخشش خداوند غفار وستار، پھر روح وریحان وجنات نعیم[۱]۔

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ الذین اٰمنوا وکانوا یتقون لھم البشرٰی فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ لاتبدیل لکلمات اللہ ذالک الفوز العظیم (پ ۱۱ ع ۱۲)

یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے۔

دیکھو یہی راز ہے جس کو پالینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجائے گا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ ہیں، اور سب سے زیادہ خیرخواہ، سب اگلے پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے کہ ہم تقوی کی زندگی

---

[۱] راحت اور غذائیں ہیں اور آرام کی جنت (سورۂ واقعہ)

اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ انتم اعلم ام اللہ؟ وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے، وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ (پ ۵ ع ۱۶) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے اور سب کاموں کے لئے کافی!

مومن جانتا ہے کہ ع

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں

اسی لئے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے، الَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ، حق تعالیٰ کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیت ہمیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے، ان کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لئے گو،

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ

ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا

ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی

اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام

ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است

ہر چند عقلِ کل شدہٗ بے جنوں مباش

(اقبالؒ)

آئیے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں۔

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(اقبالؒ)

# نفیس ترین لٹریچر

## ناول

| | |
|---|---|
| دل مصنفہ رئیس احمد جعفری | قیمت مجلد چھ روپے |
| عورت " " " | قیمت چار روپے آٹھ آنے |
| مجاہد " " " | قیمت مجلد پانچ روپے |
| دیوار مصنفہ عابدی جعفر | قیمت چار روپے |
| سنگدل مصنفہ یحییٰ صدیقی | قیمت تین روپے |
| درد مصنفہ رئیس احمد جعفری | قیمت دو روپے آٹھ آنے |
| خون مصنفہ قیسی رامپوری | قیمت تین روپے |
| چور بازار مصنفہ ابراہیم جلیس | قیمت دو روپے بارہ آنے |
| پل صراط مصنفہ سعید مظہر ایم، اے | قیمت چار روپے |
| قربانی مصنفہ عثمان علیم صدیقی | قیمت چار روپے |
| مہاجر مصنفہ رئیس احمد جعفری | قیمت چار روپے |

## افسانے و ڈرامے

| | |
|---|---|
| نیلوفر مصنفہ عزیز حسن جاوید | قیمت دو روپے چار آنے |
| قسمت " " " | " " " |
| ساز فطرت " " " | " " " |

صبر و ضبط مصنفہ عزیز حسن جاوید — قیمت دو روپے چار آنے

اتفاقات مصنفہ مرزا فدا علی خنجر — قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے

شیشہ و سنگ 〃 〃 〃 — قیمت مجلد دو روپے

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ اختر شیرانی — قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے

دھڑکتے دل مصنفہ اختر شیرانی — قیمت مجلد تین روپے

گورکی کے افسانے مصنفہ سعادت حسن منٹو — قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے

انجام حیات مصنفہ سید آلِ رسول قطبی دہلوی — قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے

آنسو مصنفہ اسلم عارف جالندھری — قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے

ملکۂ ہند مصنفہ عبد الحمید — قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے

## تاریخ

دیس سے باہر مصنفہ آغا محمد اشرف ایم، اے — قیمت دو روپے آٹھ آنے

لندن سے آداب عرض 〃 〃 — قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

تاریخ انقلابِ روس مصنفہ چودھری شیر جنگ — قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے

سکھ عہدِ اسلامی میں مصنفہ عباد اللہ گیانی — قیمت مجلد دو روپے

جب خون بہ رہا تھا مصنفہ ابو سعید بزمی ایم، اے — قیمت تین روپے

ڈھاکہ پچاس برس پہلے مصنفہ حکیم حبیب الرحمن خاں — قیمت دو روپے چار آنے

## ادب

جدید اردو شاعری مصنفہ پروفیسر عبد القادر سروری — قیمت تین روپے

ماڈرن اردو ڈکشنری مصنفہ ابو نعیم عبد الحکیم خاں نشتر — قیمت مجلد تین روپے

| | |
|---|---|
| اختر ستان مصنفہ اختر شیرانی | قیمت تین روپے |
| معاشیاتِ قومی مصنفہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں | قیمت مجلد آٹھ روپے |
| ادبستان مصنفہ مولانا خلیقی دہلوی | قیمت دو روپے آٹھ آنے |
| اردو زبان اور ہندو مصنفہ ناظم سوہاروی | قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے |
| اوراقِ پارینہ مصنفہ چودھری شیر جنگ | قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے |
| سٹینڈرڈ اردو ڈکشنری مصنفہ آغا محمد باقر | قیمت صرف بارہ روپے |
| شہناز مصنفہ اختر شیرانی | قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے |
| اشاراتِ اقبال مصنفہ عبدالرحمن طارق | قیمت مجلد تین روپے |
| مقالاتِ شیرانی مصنفہ حافظ محمود شیرانی | قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے |
| عرفانِ اقبال اور افاداتِ نیازی مصنفہ صاحبزادہ مخفی | قیمت مجلد تین روپے |
| کشکول مصنفہ رئیس احمد جعفری | قیمت مجلد پانچ روپے |
| فلسفۂ تعلیم و تربیت مصنفہ رئیس احمد جعفری | قیمت تین روپے بارہ آنے |
| رموز اقبال مصنفہ ڈاکٹر میر ولی الدین | قیمت دو روپے چار آنے |

## سوانح

| | |
|---|---|
| کمال اتاترک مصنفہ محمد توفیق مصری مترجم الٰہی خاموش | قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے |
| ہمارا قائد مترجم جہاں گرد صاحب | قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے |
| کارل مارکس اور اس کی تعلیمات مصنفہ چودھری اختر جنگ | قیمت مجلد چھ روپے آٹھ آنے |
| دید و شنید مصنفہ رئیس احمد جعفری | قیمت مجلد چھ روپے |
| تاریخ انقلاباتِ عالم (حصہ اول) مصنفہ ابوسعید بزمی ایم اے | قیمت دس روپے |